www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

ستمبر 2022

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	'خاتون اکرم' اردو کی اولین خاتون افسانہ نگار	ظفر الاسلام	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		11
جہان نسواں	گلوبلائزیشن اور تحریک آزادی نسواں	ڈاکٹر شبنم آرا	12
	خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں تانیثی فکر	ڈاکٹر توصیف احمد ڈار	15
	ماہ لقا چندا کا رنگ تغزل	ڈاکٹر سلمٰی رفیق	22
	اردو ادب اور بھگتی تحریک	ڈاکٹر منیرہ زمانی	26
	فاروقی کے خطوط جائسی کے نام	تہنیت فاطمہ	31
مسائل نسواں	مشغولیات اور گھریلو ذمہ داریوں میں توازن	خواجہ کوثر حیات	35
	عورتوں کے مسائل اور موجودہ حکومت کے اقدامات	فردوس جہاں	38
اعتراف ہنر	جدید فکر و آگہی کا شاعر: فریاد آزر	سائرہ عظیم	41
	زنفر کھوکھر بحیثیت انشائیہ نگار	زاہد ظفر	43
حسن سخن	میمونہ علی چوگلے، فرحت نادر رضوی		46
افسانہ	سب کی آنکھیں گروی ہیں اس نگری میں	قدسیہ انجم	48
	پیار کیا ہے تم ہی سے	خیر النساء علیم	50
باورچی خانہ		ارم نعیم	54
صحت	نظام بولی اور اس کے امراض	حسین فاروقی	56
آرائش و زیبائش			60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		62

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 6 شمارہ: 9 ستمبر 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages **64**

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

ہر سال پانچ ستمبر کا دن ہندوستان کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دن کو ہندوستان میں یوم اساتذہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر اسکول، کالجز اور یونیورسٹیوں میں مختلف نوعیت کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ طلبا اساتذہ کو تحائف دے کر یوم اساتذہ کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

استاد اپنے طلبا کی تربیت سازی میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ استاد اگر باکردار ہوں تو طلبا بھی باکردار ہوں گے اور اپنے استاد کی تربیت سے ملک وقوم کا نام روشن کریں گے۔ معلم کے اندر ان صفات کا ہونا از حد ضروری ہے جو ایک باشعور اور مہذب سماج کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اساتذہ کو اپنے طلبا کے تئیں مخلص ہونا چاہیے۔ ایک معلم کے لیے یہ بھی بے حد ضروری ہے کہ جتنا علم وہ اپنے پاس رکھتا ہے اس علم کو خاطر خواہ اپنے طلبا تک بھی منتقل کرے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنے طلبا کے ساتھ شفقت آمیز لہجہ اختیار کریں، ان کے ساتھ شفقت آمیز رویہ اپنائیں۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے لیے بہتر سے بہتر مواقع مہیا کریں۔

بچے کسی بھی قوم کی ملکیت اور طاقت ہوتے ہیں۔ ان پر ہماری نسلوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ آج کے طلبا کل کا مستقبل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ان کے لیے ایسی فضا ہموار کی جائے جہاں ان کی نشو ونما بہتر انداز سے ہو سکے۔ ان پر کسی بھی قسم کا بے جا دباؤ نہیں بنایا جائے بلکہ ایک بہترین ماحول میں ان کی پرورش کی جائے تاکہ ان کا مستقبل روشن ہو اور وہ ایک صالح اور ذمہ دار شہری کا فرض انجام دے سکیں۔ مختلف میدانوں میں اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ خوش مزاجی اور خوش اسلوبی بھی اچھے استاد کی خصوصیت ہے۔

مرد و زن میں بہت سی مماثل اور مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ دونوں اپنی اپنی صلاحیتوں کا استعمال بہتر طور پر کرتے ہیں۔ ان کی خدمات اپنی جگہ بے حد کارآمد اور قیمتی ہوتی ہیں۔ خاتون معلم بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنا کہ مرد معلم۔ ایک خاتون اگر معلّمہ ہے تو وہ طلبہ کی دلچسپی کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔

معلّمی کے پیشے کو بہت باوقار اور بہترین سمجھا جاتا ہے۔ خواتین کے لیے تو معلّمی سے بہتر کوئی اور متبادل نہیں ہو سکتا۔ خود محکمۂ تعلیم نے بھی مردوں کی بہ نسبت خواتین کو بحیثیت استاد زیادہ قابل اور اہم مانا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق خواتین ٹیچر کی بحالی مردوں کی بہ نسبت کثیر تعداد میں ہوئی ہے۔ اسکولی تعلیم کے اعداد و شمار میں بھی خواتین کا فیصد زیادہ ہے۔ خواتین کے لیے تدریس کا پیشہ فطری میدان بھی ہے۔ ان کا انہماک، ان کی کاوشیں اور لگن طلبہ کی تقدیر بدلنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

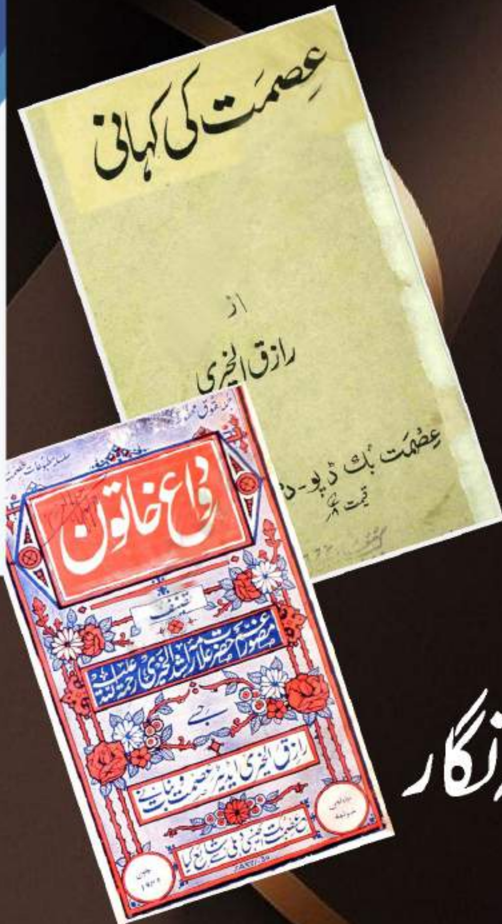

ظفر الاسلام

خاتون اکرم

اردو کی اولین خاتون افسانہ نگار

ظاہری طور پر خواتین کے مساوی حقوق کی جتنی باتیں کر لی جائیں مگر حقیقت یہی ہے کہ عورتوں کی حق تلفی ہمیشہ مردوں نے کی ہے۔ چناں چہ ادب میں بھی یہ فریضہ بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ اردو کی جس تاریخ کا مطالعہ کر لیجیے یا تذکرے دیکھ لیجیے ان میں عورتوں کی خدمات کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہم چاہیں تو اسے مردوں کی خود غرضی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ورنہ شاید ہی کوئی ایسا زمانہ گزرا ہو جس میں عورتوں نے مردوں کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک ادب میں حصہ نہ لیا ہو۔ ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ صنف نازک کے کتنے جوہر مردوں کی ہٹ دھرمی کے باعث گمنامی کی تاریکی میں پڑے رہ گئے۔ آج ان کی تخلیقات کے ہوتے ہوئے بھی ہم ان کے اصل نام اور پہچان سے نا آشنا ہیں۔ ایک مدت تک وہ بنت، دختر، بیگم، والدہ، ہمشیرہ، اور ع، غ، ز، خ، ل، م صاحبہ کے ناموں سے لکھتی رہیں۔ ابتدا میں شاید ہی کسی شعبے میں خواتین اپنے اصل نام اور مکمل شناخت کے ساتھ پہچانی جاتی تھیں۔ عورتوں کو اپنے حقوق اور شناخت کا احساس بیسویں صدی میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکثر گھرانوں میں لڑکیوں کا پڑھنا اور لکھنا تو درکنار ان کا نام بھی غیروں کی زبان پر آنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

علامہ راشد الخیری نے خواتین کے شعور کو ابھارنے اور آزادی رائے کے استعمال کے لیے جون 1908 میں ماہنامہ ''عصمت'' دہلی سے جاری کیا۔ اس کا مقصد مستورات میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا اور ان کو لکھنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ اس رسالے کی وجہ سے متعدد خواتین نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ عصمت کی ابتدائی خاتون قلم کاروں میں محترمہ اختر بانو سہروردی، امیر النساء بیگم، اے۔ ایچ فیضی، عطیہ بیگم، رضیہ مسعود الحسن، سیدہ پٹنہ، ر۔ ب امداد حسین، مسز نواب خدیو جنگ، زاہدہ خاتون شروانیہ، ہر ہائینس بیگم بھوپال، بیگم حبشان، بیگم سچین اور عباسی بیگم خاص ہیں۔ اس کے علاوہ نذر سجاد حیدر، زہرہ فیضی، عطیہ فیضی، صغریٰ ہمایوں مرزا، سلطانہ بیگم، بیگم شیخ عبداللہ، برج کماری اور حامدہ بیگم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ 1915 سے 'عصمت' کا دوسرا دور شروع ہوا۔ 1919 سے اس کا بہت کچھ کام رازق الخیری کرنے لگے تھے مگر خود مختار اڈیٹر نہ تھے۔ اس دور میں بھی عصمت نے خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی اور بہت سی ہونہار لکھنے والیاں پیدا کیں۔ جن میں اکثر نے مستقبل میں کامیاب مضمون نگار کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ ان میں خاص طور سے منجھو بیگم (م۔ب لکھنوی)، نجمہ امتیاز جہاں، لطیف بیگم، حمیدہ بیگم، صغرا بیگم، سیدہ اصغری بیگم، مسز کاظم، زہرہ اختر بیگم، رضیہ بیگم، زہرہ سلطانہ، نصیرہ شمس، زاہدہ خاتون (ز۔ مرادآبادی) بلقیس بیگم

قرۃ العین، ام الحلیمہ مریم، آسیہ بائی، مسز مجیب الرحمٰن اور محترمہ ''خاتون اکرم'' کا نام خاصا اہمیت کا حامل ہے۔

خاتون اکرم کی پیدائش 17 نومبر 1900 کو جھانسی میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام ڈاکٹر عبدالغفور مطیر تھا وہ انگریزی حکومت میں ملازم تھے۔ آپ ایک حاذق طبیب کے علاوہ ایک کہنہ مشق شاعر اور انشاپرداز بھی تھے۔ (ان کے کلام اور نثری مضامین کو 'انتخاب کلام مطیر'' کے نام سے ان کے فرزند ارجمند احسن الغفور نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔) محترمہ کے گھر کا ماحول خاصا علمی اور ادبی تھا، بڑے بھائی احسن الغفور علی گڑھ کے گریجویٹ تھے اور ڈپٹی انسپکٹر آف محمڈن اسکول کے عہدے پر فائز تھے۔ لہٰذا ان کی پرورش بھی اسی علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ شروع سے ہی ان کی تعلیم کی جانب خاص توجہ دی گئی، یہاں تک کہ پندرہ برس کی عمر میں وہ گلستاں و بوستاں کے علاوہ فارسی نثر کی اکثر کتابیں پڑھ چکی تھیں۔ فارسی ادب پر آزاد اور شبلی کی تمام کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ ہندی اور انگریزی کی بھی انھیں خاص معلومات تھی۔ ایک انگریز خاتون انھیں انگریزی سکھانے آتی تھیں۔ خاتون اکرم اردو کے معروف شاعر 'معین احسن جذبی' کی سگی پھوپھی تھیں۔ جذبی 'امتیاز احمد' کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ان کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

''ہماری ایک پھوپھی تھیں مرحومہ خاتون اکرم، ان کی شادی بعد کو راشد الخیری کے بڑے لڑکے رازق الخیری سے ہوئی تھی جو عصمت کے اڈیٹر تھے۔ شادی کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا، وہ بہت ہی خموش اور بہت ہی سنجیدہ قسم کی خاتون تھیں، مضامین لکھتی تھیں۔۔۔ ان کے مضامین تہذیب نسواں میں شائع ہوتے تھے۔ انعامات بھی ان کو ملتے تھے۔ پھر وہ افسانہ نگاری کی طرف آئی تھیں۔ یہ سمجھیے کہ سن 23،24 کی بات ہے اور ایک افسانہ تو مجھے یاد ہے کہ وہ لکھ رہی تھیں تو میں کہیں سے کھیلتا کھاتا آیا۔ میں نے کہا لائیے پھوپھی جان میں لکھتا ہوں، آپ بولتی جائیے۔ تو پورا افسانہ انھوں نے Dictate کرا دیا۔ پھر انتقال ہو گیا۔''

(ماہنامہ 'کتاب نما' مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی، اکتوبر 1990، ص 103)

1923 میں 'عصمت' کی مکمل ذمہ داری رازق الخیری اور خاتون اکرم کے سپرد کر دی گئیں اور یہ طے ہوا کہ یکم نومبر سے تمام آمدنی اور خرچ خاتون کے ذمے ہوں۔ دونوں نے مل کر جنوری سے 'عصمت' کو بہت بلند پیمانے پر شائع کرنے کی اسکیم بنائی اور اس کے متعلق تیاریاں شروع کر دیں۔ مگر نومبر کے ابتدائی ہفتے میں ہی خاتون اکرم سخت بیمار ہو گئیں اور 15,14 نومبر 1924 کی درمیانی شب محض 24 برس کی عمر میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کا بچہ ''سعد'' محض ایک برس کا تھا۔ ان کی وفات کے متعلق ان کے شوہر رازق الخیری لکھتے ہیں:

''نومبر کا پہلا ہفتہ خاتون مرحومہ کا بہت مصروفیت کا گذرا تھا۔ ۷ نومبر کو انھیں بخار چڑھا اور 14، 15 نومبر کی درمیانی شب وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں اور عصمت کو اور طبقہ نسواں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا، ترقی عصمت کے تمام ارادے خاک میں مل گئے، زندگی کی بہت سی امنگوں کا خاتمہ ہو گیا۔''

(عصمت کی کہانی، رازق الخیری، عصمت بک ڈپو دہلی، ستمبر 1939، ص:34)

ان کی تربت پر یہ کتبہ تحریر ہے۔

''خدا را اس طرف آنا تو پڑھ کر فاتحہ جانا
غریب و نیک بچی بے زبان و بے وطن ہے یہ
بہو راشد کی ہے خاتون اکرم ہادیٔ نسواں
دلہن جھانسی سے جو آئی تھی وہ رازق دلہن ہے یہ''

(ماہنامہ 'عصمت' خاتون اکرم نمبر، رازق الخیری، نومبر۔ دسمبر 1924، ص:14)

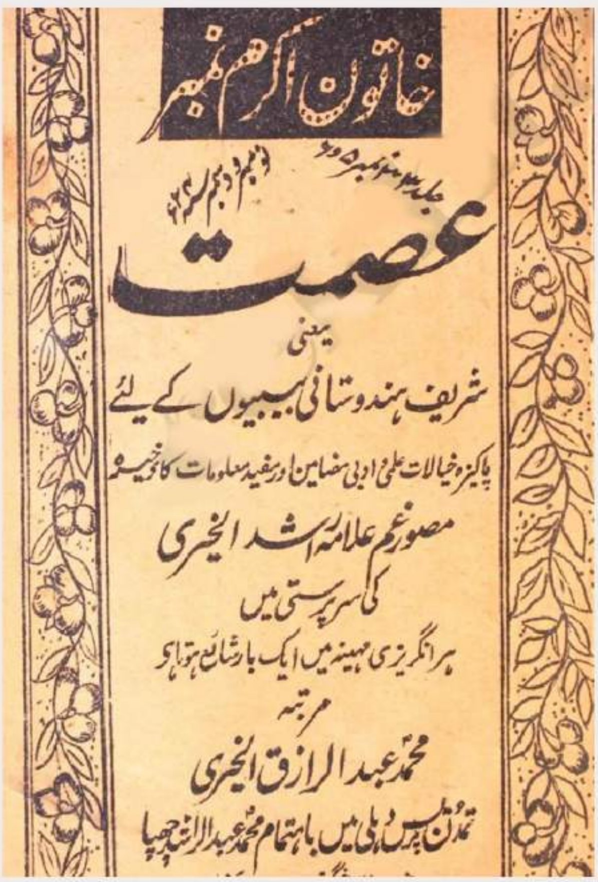

علامہ راشدالخیری اپنی بہو خاتون اکرم کو ''رازق دلہن'' کے نام سے یاد کرتے ہوئے رنج وغم کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''رازق دلہن کی موت نے میری بہت سی خواہشوں کا خاتمہ کر دیا۔ مگر وہ اپنی قابلیت اور فرماں برداری کے ایسے سدا بہار پھول میرے دل پر کھلا گئی کہ میں جب تک زندہ ہوں اس کو فراموش نہیں کرسکتا۔ مرنے والی خاتون دلّی والوں کو دکھا اور کنبہ والوں کو بتا گئی کہ بیوی کیا ہوتی ہے اور بہو کس کو کہتے ہیں۔ وہ میرے گھر میں صرف دو سال کی مہمان تھی، آئی رہی، چلی گئی۔ مگر اس کا قیام بہوؤں کے لیے سبق اور بیٹیوں کے لیے نمونہ ہے۔ جس بات کو یاد کرتا ہوں وہی خون کے آنسو رُلواتی ہے۔''

(ماہنامہ 'عصمت' خاتون اکرم نمبر، رازق الخیری، نومبر۔ دسمبر 1924، ص:13)

خاتون اکرم کا پہلا افسانہ سترہ برس کی عمر میں ''جدت پرست'' کے عنوان سے 1917 میں ماہنامہ 'عصمت دہلی' میں شائع ہوا۔ ان کا آخری افسانہ بھی اسی رسالے کے اکتوبر 1924 کے شمارے میں چھپا۔ یہ دونوں افسانے ''گلستان خاتون'' میں شامل ہیں۔ ابتدا میں وہ فرضی ناموں سے لکھتی رہیں۔ بعد میں ہمشیرہ احسن الغفور اور مس مطیر کے نام سے بھی لکھنے لگیں۔ 28/دسمبر 1922 کو ان کا نکاح مولانا رازق الخیری سے ہوا، اور 26/فروری 1923 کو وہ دلہن بن کر علامہ راشدالخیری کے گھر دریا گنج دہلی آ گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے اصل نام (خاتون اکرم) اور 'رازق دلہن' کے نام سے مضامین اور افسانے تحریر کیے۔ ان کی تخلیقات عصمت کے علاوہ اخبار تہذیب لاہور، شباب اردو لاہور، استانی دہلی وغیرہ میں بھی شائع ہوتی تھیں۔

خاتون اکرم کے افسانے ان کی زندگی میں تو کتابی شکل میں شائع نہیں ہو سکے مگر انتقال کے بعد ان کے شوہر مولانا رازق الخیری نے انھیں کتابی شکل میں یکجا کیا۔ یہ مجموعہ ''گلستان خاتون'' کے نام سے 1931 میں عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوا۔ اس طرح وہ پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جن کا افسانوی مجموعہ کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اس میں کل گیارہ افسانے مختلف عنوانات کے تحت شامل ہیں۔ منشی پریم چند ''گلستان خاتون'' کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''مرحومہ کے قریب سب افسانے اصلاحی جذبات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ ایسے قصوں میں اگر مصنف قاری کے ان جذبات کو ہیجان میں لانے میں کامیاب ہو جائے جو اس کے خیال میں موضوع قصہ کی اصلاح کے لیے درکار ہیں تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ اگر افسانے میں جانب داری یا تعصب کی جھلک آ گئی تو یہ مصنف کی ناکامی کی دلیل ہے۔ گلستان خاتون کے افسانے ناظر کے دل میں مصنفہ کے مقصد سے ہمدردی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔۔۔ سب قصے بیان کی روانی اور زبان کی لطافت اور مذاق کی شستگی وغیرہ کی خوبیوں سے آراستہ ہیں اور مصنفہ کے قومی درد، جذبہ اصلاح اور عالی نفسی کے آئینے ہیں۔''

(منشی پریم چند، گلستان خاتون کے متعلق آرا، گلستان خاتون، عصمت بک ایجنسی، بار سوم اگست 1940، ص 115)

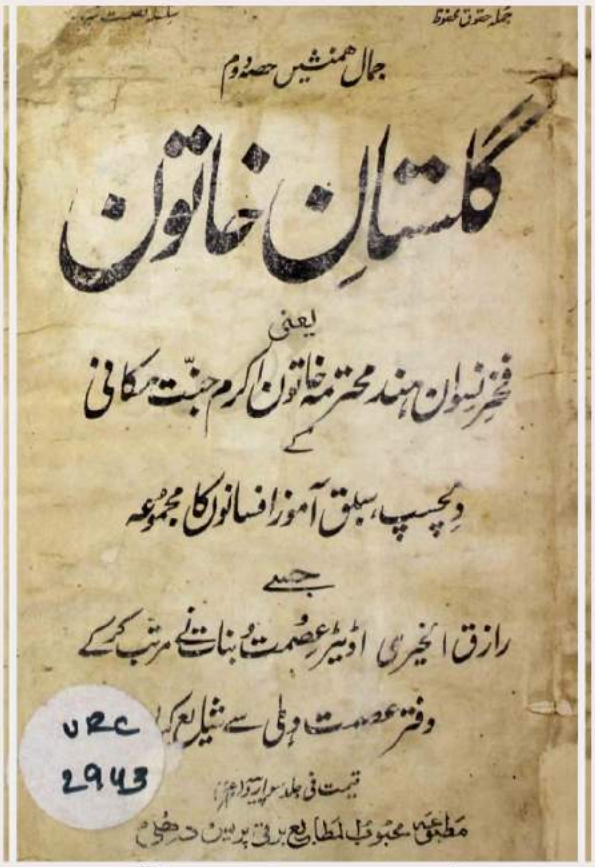

خاتون اکرم کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ وہ مشرقی ادب کے علاوہ مغربی ادب سے بھی آگاہ تھیں۔ انگریزی اخبارات کا مطالعہ بھی کیا کرتی تھیں۔ جس سے ان کے ذہن میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی تھی۔ چناں چہ آپ کا فہم و ادراک اور شعور بہت زیادہ بلند تھا۔ ان کے بیش تر افسانے معاشرتی اور ازدواجی زندگی کی اصلاح، طبقۂ نسواں کی اخلاقی درستگی، تحفظ حقوق خواتین اور تربیت اولاد کے نقطۂ نظر سے تحریر کیے گئے

ہیں۔ ان کے افسانوں میں مشرقی تہذیب کی خوبیوں اور مغربی رسوم کی خرابیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عورتوں کے ساتھ کیے جانے والے اہانت آمیز سلوک کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ عورتوں کے استحصال، مردوں کے جابرانہ رویے اور تسلط پر انھوں نے پُر زور قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے خواتین کی راہ میں رکاوٹ اور پابندیوں کی واضح الفاظ میں مزمت کی ہے۔ ایک طبقے نے ان کی مخالفت بھی کی مگر انھوں نے خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا اور پوری زندگی وہ اپنی تحریروں سے ان کا جواب دیتی رہیں۔ ان کے افسانوں کی افادیت کو ظاہر کرنے کے لیے ''گلستان خاتون'' کا سرسری مطالعہ پیش خدمت ہے۔

شہید ظلم: اس افسانے میں خاتون اکرم نے زبردستی کی شادی کو موضوع بنا کر خلع جیسے اہم مسئلے کو پیش کیا ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر ازدواجی تعلقات میں کوششوں کے باوجود بھی بہتری کی صورت پیدا نہ ہو رہی ہو تو علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ کیوں کہ اگر شوہر بیوی سے ناخوش ہے اور بیوی یہ چاہتی ہے کہ وہ اسی کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزار دے تو اس حالت میں ازدواجی زندگی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان حالات میں عورت کو خلع دلوا دینا چاہیے۔ چوں کہ شریعت میں بھی اس کی اجازت ہے۔ تاکہ بیوی شوہر سے رہائی حاصل کر کے پرسکون زندگی بسر کر سکے۔ ''خدا کے لیے عورتوں پر ترس کھاؤ، ان کی حالت زار پر رحم کرو اور خلع کے لیے کوشش کرو۔ اس کو رواج دو۔''

سچ کی فتح: اس افسانے میں اشفاق احمد اور محمودہ کی ازدواجی زندگی کے فسانے بیان کیے گئے ہیں۔ اشفاق احمد کے نزدیک عورت میں وفا نام کی کوئی چیز نہیں وہ بے وفائی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس محمودہ کو شوہر پرست بیوی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ والدین کی وفات کے بعد ایک دن شوہر بیوی کو بتائے بغیر شہر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ محمودہ اس جدائی کو برداشت نہیں کر پاتی ہے اور وہ بھی گھر چھوڑ کر کلکتہ روانہ ہو جاتی ہے۔ حالات سے تنگ آ کر وہ خودکشی کی ناکام کوشش کرتی ہے، جس کے جرم میں عدالت اسے سزا سناتی ہے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیں کہ جس کی بدولت وہ اس حالت تک پہنچی سزا بھی اسی کے قلم سے ہوئی۔ بیوی سے اس کا سامنا اس وقت ہوا جب وہ جیل خانے کے دورے پر جا رہا تھا۔ جیل خانے کا داروغہ یہ کہتے ہوئے جج صاحب کی توجہ مظلومہ کی طرف کراتا ہے (کیوں کہ محمودہ کورٹ میں چہرہ چھپائے مظلومہ کے نام سے پیش ہوئی تھی) کہ حضور اس عورت نے ایک تصویر اپنے پاس چھپا رکھی تھی۔ کل ہم لوگوں نے دیکھی اور اس سے لے لی۔ جس کے لیے وہ بہت چیخی چلائی اور کہتی رہی کہ اس تصویر کو مجھے دے دو یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ جج صاحب کے مانگنے پر جب وہ تصویر انھیں دکھائی گئی تو وہ چلا کر کہتے ہیں: ''مظلومہ! نہیں۔ نہیں۔ محمودہ! آہ میری پیاری۔ وفا شعار۔ محبت شعار بیوی محمودہ!'' اس طرح محمودہ اس خوبی کے ساتھ عورت کی وفاداری کو ثابت کرتی ہے کہ اشفاق احمد کو اپنے خیالات بدلنے پڑتے ہیں اور وہ یہ کہنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ عورت بے وفائی کا دوسرا نام نہیں بلکہ وفاداری اور جاں نثاری کا مجسمہ ہے۔

انوکھی توبہ: رابندر ناتھ ٹیگور کے بنگالی افسانے کا ترجمہ ہے۔ یہ افسانہ بابو ناتھ بندھ اور بندھ باسنی کی ازدواجی زندگی سے متعلق ہے۔ عورت کی وفاداری اور شوہر پرستی پر مبنی اس کہانی میں اس بات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ بندھ بانسی کس طرح اپنے سست، کاہل اور بداخلاق شوہر کے رویے سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ بابو ناتھ بندھ سسرال میں چوری کر کے ولایت بھاگ جاتا ہے مگر وفاشعار بیوی اس چوری کا الزام اپنے سر لے لیتی ہے اور اس کی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتی ہے۔

بالائی آمدنی: اس افسانے میں نور جہاں مغرب کی تقلید میں اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اپنے سب انسپکٹر شوہر احمد بیگ کو بالائی آمدنی حاصل کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ شوہر پہلے تو اچھی تربیت کی وجہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب بیوی کی فضول خرچیوں کی وجہ سے گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو جاتا ہے تو اس نے ایک مرتبہ کچھ رقم رشوت کے طور پر لے لی۔ مگر جلد ہی وہ روز کا معمول بن گیا یہاں تک کہ رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا۔ مقدمہ چلا اور احمد بیگ ملازمت سے برخاست کر دیا گیا، اس کی ملازمت بیوی کی فضول خرچیوں کی نذر ہو گئی۔ پھر بیوی پر مشکل وقت شروع ہوا۔ ایک رات اس نے خواب میں اپنی ماں کو دیکھا جو اسے مغرب کی اندھی تقلید پر طعن و تشنیع کرتی ہے۔ ''کمبخت رشوت کا سارا جرم تیرے سر ہے۔ احمد کو ایسے برے کاموں کی صلاح دینے والی تم ہو۔ اس کو ابھارنے والی تم ہو۔ اس کا مواخذہ اور پرشش بھی تجھی سے ہوگی۔'' آخر وہی بیوی جو پہلے بالائی آمدنی کے لیے بے چین تھی اپنے شوہر کو تلقین کرتی ہے کہ رشوت کو ہاتھ نہ لگانا۔ اس افسانے کے ذریعہ خاتون اکرم نے سماج کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔

آرزوؤں پر قربانی: یہ افسانہ عورتوں کی نفسیات پر مبنی ہے جن کی ضد، انا پرستی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے بعض دفعہ ان کی ازدواجی زندگی پیچیدگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسی ضدی ماں کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنی بچی کو محض اس لیے روزہ رکھواتی ہے کہ گھر میں روزہ

کشائی کی تقریب منعقد ہوگی، مہمانوں کی دعوت ہوگی۔ لہٰذا چار برس کی رقیہ کو روزہ رکھوایا جاتا ہے اور تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تقریب کے انتظامات میں ثریا اس قدر مشغول ہوگئی کہ بچی سے بالکل بے خبر ہوگئی۔ یہاں تک کہ افطار کے قریب ناعاقبت اندیش ماں کو بچی کا خیال آیا اور اس کی تلاش شروع ہوئی مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ مردانے میں بھی پوچھا گیا مگر وہاں بھی نہ ملی۔ اس کے بعد پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی، سب نے ذرا ذرا سا افطار کیا اور بچی کی تلاش ہوتی رہی۔ گھر کے اندر ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جہاں ماما اپنے لیے پانی کا گھڑا رکھا کرتی تھیں۔ آخر پون گھنٹے بعد رقیہ پانی کے گھڑے پر منہ کے بل پڑی ہوئی ملی۔ بچی پیاس کے مارے صراحی پر منہ رکھ کر ماں کی آرزوؤں کو پورا کرتے کرتے اپنی جان کی بازی ہار چکی تھی۔

تربیت اولاد: اس افسانے کے شروع میں بچے کی بدتہذیبی اور تربیت نہ ملنے کی وجہ سے لڑائی جھگڑا کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پھر اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ بچے کی تربیت چھوٹی عمر سے ہی شروع کر دینی چاہیے۔ سب سے پہلے اسے اطاعت کا سبق پڑھانا چاہیے۔ کیوں کہ بچے کی ضد، شرارت اور نافرنانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ طبیعتاً ایسا ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ماں کم علم ہے جو سہی تربیت نہیں کر سکی۔ اس افسانے میں اولاد کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ کیوں کہ اچھی پرورش کے لیے تعلیم اور تربیت دونوں ضروری ہیں۔

طرز زندگی: خاتون اکرم کا یہ افسانہ ایک اہم معاشرتی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں اختلاف کبھی خوش گواری پیدا نہیں کر سکتا۔ اس افسانے کی ہیروئن ساجدہ غیر تعلیم یافتہ اور پرانے خیالات کی لڑکی ہے۔ اس کی شادی ایک روشن خیال اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈپٹی کلکٹر حامد سے ہوتی ہے۔ دونوں کے خیالات میں تضاد ہے۔ یہاں تک کہ حامد اس کی قدامت پرستی سے تنگ آکر دوسری شادی کر لیتا ہے۔ دوسری بیوی ناصرہ نہایت نیک اور شریف ہے۔ وہ اپنی سوکن ساجدہ کو بڑے ہی موثر انداز میں سمجھاتی ہے کہ اگر تم شوہر کی محبت چاہتی ہو تو اس کی اطاعت کرو اور اس کے مزاج کے مطابق زندگی کو تبدیل کر لو۔

انقلاب زمانہ: معاشرے کے تلخ موضوع پر تحریر کیا گیا افسانہ ہے۔ اس میں ایک سوتیلی ماں بیٹی حسنا پر ظلم و ستم کرتی ہے۔ جب حسنا کی ماں بستر مرگ پر تھی تو اس نے اپنے شوہر سے عہد لیا تھا کہ وہ دوسری شادی نہیں کریں گے۔ مگر بیوی کے انتقال کے چھ ماہ بعد ہی شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے۔ کچے ذہن کی بچی اپنی اصل ماں کو تو بھول جاتی ہے مگر سوتیلی ماں کی اذیتوں کی وجہ سے سکون سے نہیں رہ پاتی۔ نہ اس کے پاس معقول کپڑے ہیں نہ چھوٹی بہنوں جیسی سہولتیں۔ یہاں تک کہ باپ بھی حسنا کی طرف سے لاتعلق ہے۔ خیر کسی طرح اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد حالات نے سوتیلی ماں کو ملازمہ کی حیثیت سے اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ مگر حسنا اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ نہایت ہی ادب واحترام اور عزت کے ساتھ پیش آئی۔ یہ افسانہ ان عورتوں کے لیے سبق آموز ہے جو اپنے سوتیلے بچوں پر ظلم کرتی ہیں۔

جدّت پرست: اس افسانے میں ان خواتین کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو اپنے حسن، بناؤ سنگھار، غرور اور فیشن میں اس قدر غرق رہتی ہیں کہ اپنے فرائض تک کو بھول جاتی ہیں۔

مرغ کی کہانی: یہ ایک علامتی افسانہ ہے جس میں مرغ کی زندگی کے ذریعے میاں بیوی کے تعلقات پر فلسفیانہ گفتگو کی گئی ہے۔ افسانے میں آزادی اور غلامی کے فرق کو واضح کرتے ہوئے بیوی کے حقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسری شادی: اس افسانے میں وقت بے وقت مذاق کرنے کے نقصانات بیان کیے گئے ہیں۔ زرینہ ایک ایسی بیوی ہے جو ہر وقت مذاق کرنے کی عادی ہے۔ ایک روز وہ اپنے شوہر کو مذاقاً دوسری شادی کا مشورہ دے دیتی ہے۔ شوہر اس مذاق کو سنجیدگی سے لے لیتا ہے اور دوسری شادی کر لیتا ہے۔ سوکن کے آنے سے میاں بیوی کے درمیان کشیدگی آجاتی ہے۔ افسانے سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ بنا سوچے سمجھے کچھ بھی نہیں بولنا چاہیے۔ بعض دفعہ یہ کافی مہنگا پڑ جاتا ہے۔

مذکورہ افسانوں کے علاوہ ان کے دو طویل افسانے ''پیکر وفا'' اور ''بچھڑی بیٹی'' علیحدہ علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیے گئے ہیں۔ ان کے وہ مضامین جو پہلے رسالوں میں شائع ہو چکے تھے انھیں ''جمال ہم نشین'' کے نام سے رازق الخیری نے مرتب کر کے 1927 میں دفتر عصمت دہلی سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں بیس مضامین اور علامہ راشد الخیری کا دیباچہ شامل ہے۔

خاتون اکرم نے انسانی زندگی کا مطالعہ اچھی طرح سے کیا تھا، ان کے کردار نہ تو محلوں کے رہنے والے امیر ہیں اور نہ جھونپڑوں کے غریب بلکہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ خواتین کی تفصیلات سے خوب واقف ہیں لہٰذا ان کی کہانیوں میں عورتوں کی مختلف کیفیات بیان کی گئی ہیں۔ وہ عورت میں ایثار، محبت، اطاعت اور خدمت کے جذبات دکھاتی ہیں مگر کبھی مبالغہ سے کام نہیں لیتیں۔ وہ اردو انگریزی کے علاوہ فارسی اور

ہندی سے بھی واقف تھیں اس لیے ان کی کہانیوں میں مختلف النوع قسم کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان کے پلاٹ آسان اور مختصر ہیں۔ ان کے بیش تر افسانوں میں ایک نقطہ یا یک موضوعی کہانی بیان کی گئی ہے۔ خواہ مخواہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے وہ سیدھے سادے انداز میں کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔

ان کی منظر کشی بھی قابل تعریف ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں ایسی منظر کشی کرتی ہیں کہ سارا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جذئیات نگاری سے بھی انھوں نے اپنے افسانوں کو مکمل اور دلکش بنانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے افسانوں کے لیے جو اسلوب انداز انھوں نے اختیار کیا ہے وہ نہایت عمدہ ہے۔ خاتون اکرم کے افسانے اور مضامین کی تعریف اس وقت کے اکثر ادبا و شعرا نے کی ہے۔ ان میں علامہ راشد لخیری، مولانا محمد علی، اکبر الہ آبادی، تلوک چند محروم، عزیز لکھنوی، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق وغیرہ خاص ہیں۔ منشی پریم چند ان کی شخصیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''محترمہ خاتون اکرم مرحومہ کی کتابیں پڑھ کر مجھ پر ان کی ادبیت سے زیادہ ان کی شخصیت کا اثر ہوا۔ اچھی کہانیاں لکھنے والی تو اور دیویاں بھی ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ جن کے قول اور عمل میں مناسبت ہو، جو کچھ دوسروں کو سکھاتی ہوں خود بھی اس پر چلتی ہوں۔۔۔۔ خاتون اکرم صاحبہ کی زندگی قدیم اور جدید معیار حیات کا نہایت متناسب اتحاد تھی۔ ان میں خدمت کی لگن ہے۔ قربانی کی تمنا ہے۔ وہ تحمل اور سعی کی دیوی ہیں۔ مسلم خواتین کی ساری خوبیاں ان میں مجتمع ہوگئی ہیں۔ (سسرال کے) پونے دو سال میں جس ہستی نے حضرت علامہ راشدالخیری کے قلم سے یہ خراج حاصل کیا۔ ''جس کی ہر ادا نے میرا دل مسخر کرلیا۔ میرے گھر میں چار دن کی چاندنی تھی۔ میں دیکھتا تھا اور دنگ رہ جاتا تھا کہ وہ ایک طرف مغرب کے مشاہیر پر رائے زنی کر رہی ہے تو دوسری طرف جامی، سعدی اور خسرو پر بے باکانہ گفتگو''۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کی خاتون تھی۔''

(بحوالہ صاق الخیری، ماہنامہ 'ساقی' دہلی، نومبر 1938، ص:4،5)

خاتون اکرم کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ادب کو محض دل بہلانے کا ذریعہ نہیں سمجھتی تھیں بلکہ ان کے نزدیک ادب سے بہترین کام لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں دوسری خواتین کی طرح خیالی دنیا کی بے سروپا حکایتیں نہیں سنائیں بلکہ حیات انسانی کے

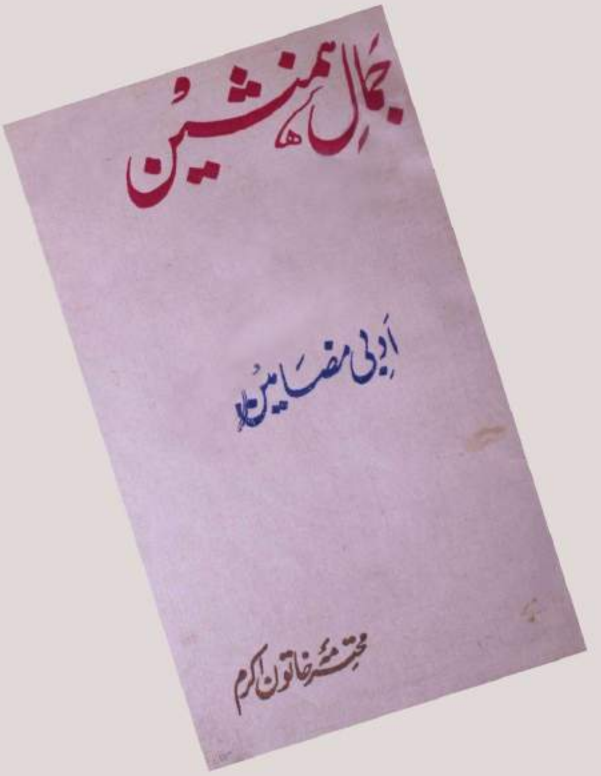

حقیقی قصے بیان کیے ہیں۔ ان میں تلخی، حقیقی جدوجہد اور عورتوں کی مظلومی کا نوحہ بیان ہوا ہے۔ ان کے مطالعہ کے بعد قاری تفکر پر آمادہ نظر آتا ہے۔ وہ حمایت نسواں کی حامی تھیں۔ انھیں اپنی صنف کی زبوں حالی کا پورا پورا احساس تھا۔ ان کے افسانے سماج میں رائج بری رسموں کی خرابیوں اور مشرقی تہذیب پر مغربی معاشرت کے اثرات کے آئینہ دار ہیں۔ خاتون اکرم نے بہت مختصر زندگی پائی اگر قدرت انھیں مزید مہلت دیتی تو یقیناً ان کا شمار عظیم افسانہ نگاروں میں ہوتا۔

کتابیات:

1۔ ماہنامہ 'عصمت' خاتون اکرم نمبر، رازق الخیری، نومبر، دسمبر 1924
2۔ 'جمال ہمنشین' محترمہ خاتون اکرم، مرتب رازق الخیری، دفتر عصمت دہلی، نومبر 1927
3۔ 'گلستان خاتون' محترمہ خاتون اکرم، مرتب رازق الخیری، دفتر عصمت دہلی، 1931
4۔ ماہنامہ 'ساقی' دہلی، شاہد احمد دہلوی، نومبر 1938
5۔ 'عصمت کی کہانی' رازق الخیری، عصمت بک ڈپو دہلی، ستمبر 1939
6۔ 'وداع خاتون' علامہ راشدالخیری، عصمت بک ایجنسی دہلی، چوتھی مرتبہ جون 1942

□□□

Zafrul Islam
Vill- Karimuddinpur
Post Ghosi Distt. Mau-275304(U.P)
Mob: 9336239933

شاعرات کے منتخب اشعار

بھول جاتے ہیں تقدس کے حسیں پل کتنے
لوگ جذبات میں ہو جاتے ہیں پاگل کتنے

روز خوشبو کے مقدر میں رہی خود سوزی
اپنی ہی آگ میں جلتے رہے صندل کتنے
رفیعہ شبنم عابدی

ٹوٹ کر اندر سے بکھرے اور ہم جل تھل ہوئے
تجھ سے جب بچھڑے تو اتنا روئے ہم بادل ہوئے

تھے کبھی آباد جو زخموں کے پھولوں سے یہاں
دیکھنا وہ شہر اس موسم میں سب جنگل ہوئے
صدیقہ شبنم

تختۂ مشق زندگی ہوں میں
حرف تمہید آگہی ہوں میں

ہر حقیقت پس حقیقت ہے
یہ حقیقت بھی جانتی ہوں میں
سکینہ ساجد پنہاں

یہ دیکھنے کے لیے بار بار لوٹتی ہوں
کہ کاش تو مرے جانے پہ سوگوار ملے

ہر ایک سو رہا ہے اپنی ایک آنکھ کھول کر
اب اعتبار زندگی ہے رت جگوں کے ہاتھ میں
حمیرا رحمٰن

عذاب ہجر سہنے کے لیے دکھ کے کھنڈر میں ہو
کبھی میری طرح وہ بھی صداؤں کے بھنور میں ہو

ہمیں شہناز بس اس وقت تک صفحوں میں رہنا ہے
ہرا ہو جب تلک لہجہ، بموجب تک ہنر ہو
شہناز نبی

گونجتی وادی میں آواز ابھی باقی ہے
تار ٹوٹے ہیں تو کیا ساز ابھی باقی ہے

پھر زمین کھینچ رہی ہے مجھے اپنی جانب
میں رکوں کیسے کہ پرواز ابھی باقی ہے
علینا عترت

منزلیں آئیں تو رستے کھو گئے
آبگینے تھے کہ پتھر ہو گئے

بے گناہی ظلمتوں میں قید تھی
داغ پھر کس کے سمندر دھو گئے
عفت زریں

جس نے بھی داستاں لکھی ہوگی
کچھ تو سچائی بھی رہی ہوگی

کیا کروں دوسرے جنم کا میں
زندگی کل بھی اجنبی ہوگی
شائستہ یوسف

(ماخذ www.rekhta.org)

گلوبلائزیشن اور تحریک آزادی نسواں

ڈاکٹر شبنم آرا

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آج ہم گلوبلائزیشن کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے مثبت اور منفی اثرات ہماری سوسائٹی اور زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر رہے ہیں۔ مغربی تہذیب اور جدید ٹکنالوجی بڑی تیزی سے ہندوستان کی سماجی زندگی پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ مغرب میں ہی پروان چڑھنے والی تحریک جسے ہم تحریک آزادی نسواں کے نام سے جانتے ہیں، اس تحریک کے اثرات ہندوستانی سماج، ادب، سیاست، معیشت اور اقتصادی فلسفے کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔ آج جب کہ دوسرے تمام شعبوں میں تحریک آزادی نسواں اور اس کی اہمیت اور افادیت پر ڈسکورس اور مذاکرے کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور اس کے توسط سے تحریک آزادی نسواں، حقوق نسواں یا بیداری نسواں جیسے عنوانات کے تحت اس موضوع کی معنویت کو سمجھنے کی کوششیں جاری ہیں اور عورت کے بدلتے روپ کو معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے اور اس کی شرکت کو قبول کیا جا رہا ہے۔ ادب میں بھی ان تمام مسائل کی ترجمانی کو اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ وہ تانیثی آواز جو صدیوں سے ایک حصار میں مقید رکھی گئی یا پیروں تلے روندھی جاتی رہی، گلوبلائیزیشن کے اس زمانے میں تیزی سے ابھر رہی ہے۔ اب تانیثی ادب میں آئیڈیلزم سے زیادہ (Realism) حقیقت کو پیش کرنے کا رجحان غالب ہوتا جا رہا ہے۔ یوں تو تانیثی ادب کے مسائل تقریباً سبھی زبانوں میں ایک سے ہیں وہ قومی ہوں یا بین الاقوامی، اس لیے ان کی جانب توجہ دی جا رہی ہے۔ اس تحریک کے ہی ذریعے جدید عورت ادبی سطح پر مختلف موضوعات، زاویہ نظر اور Approach کے اعتبار سے ایک ایجنڈا تشکیل دینے میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ اب یہ ایجنڈا ایک الگ ثقافت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ نئے نئے استعارات، تشبیہات اور تلمیحات کو وضع کر کے ایک نئی تمدنی Domain کی تشکیل میں مصروف ہیں اور عورت کے تجربات کی سچائیوں کو انتہائی بے باک اظہار سے مربوط کر کے بہت سے ان لکھے اور ان کہے ممنوعہ جذبوں کے حوالے سے ایک ایسی فضا مرتب کر دی گئی ہے جس میں عورت ایک سراپا احتجاج بن کر ابھری ہے۔ یہ احتجاج اسی روایتی معاشرے کے اس رویے کے خلاف ہے جس میں عورت کے احساس اور جذبات کی خالصیت کو مذہب، سماج، قانون اور اخلاقی قدروں کے نام پر ہمیشہ جھٹلایا جا رہا ہے اور یہ دوہرا رویہ عورت کو اپنے وجود کے مکمل ادراک سے محروم رکھے ہوا تھا۔ لیکن جدید عورت کے یہاں اب عورت کی آواز ایسی آواز بن کر ابھر رہی ہے جو اپنے وجود میں ایک مکمل عورت ہے اور اپنے بھرپور اظہار پر مصر۔ عورت کو معاشرہ جس آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور وہ خود اپنی آنکھ سے جس طرح معاشرے اور اپنے اندر کی دنیا کو دیکھتی ہے، اسے ایک دوسرے سے آمیز کرتی ہے۔ یہ سب کیفیات بالکل فطری اور اوریجنل ہیں جس سے ہمارے ادب کا دامن خالی تھا۔ ان فنکاروں نے اپنی تخلیقات کو ان خیالات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

آج کی جدید عورت اپنی شناخت کی تلاش کرتی ہوئی اپنے کو مرد سے الگ ایک اکائی یا وحدت کے روپ میں دیکھنے لگی ہے۔ اس وحدت نے عورت کو معاشی طور پر آمدنی کے ذریعہ ڈھونڈ نکالنے کی ترغیب دی اور اس نے مرد کی بنائی ہوئی قدروں کے جال سے باہر نکل آنے کی تگ و دو کی۔ ادب وفنون لطیفہ میں اپنی شخصیت اور صلاحیتوں کو ماہرانہ طریقے سے پیش کرنے کی کوششیں کیں۔ ان فنکاروں کے یہاں ایک افتادہ بے حال اور کمزور عورت کے بجائے ایک ایسی بھرپور عورت مکالمہ کرتی نظر آتی ہے جو زندگی کے ہر محاذ پر جسمانی اور ذہنی اعتبار سے مردوں کی ہمسری اور برابری کے لیے تیار ہے۔ بقول کشور ناہید:

''عورت اپنی حیاتی سطح پر مرد کی حاکمیت اور برتری سے نفرت کرتی ہے، مگر کیوں نہ ایسے ماحول اور سماج کو ہی ختم کر دیا جائے جو مرد کی حاکمیت اور عورت کو محکومیت کی اخلاقیات میں پروتا ہے۔ آج کی بہت سی عورتیں جو آزاد اور معاشی طور پر مستحکم ہیں اور خود کو آزاد فرد متصور بھی کرتی ہیں وہ آج بھی اپنی جنسی زندگی کو روایتی غلامی کا عکس ہی سمجھتی ہیں کہ مرد کے نیچے لیٹنا، مرد کا دخول، یہ ساری باتیں ان کو تشنج کا شکار اور یخ بستگی کا شکار بنا دیتی ہیں۔ ہاں اگر حقیقت احوال بدل جائے تو یہ مساوی سوچ اور یہ سارے تجربے بدل سکتے ہیں اور یہی جنسی عمل جو فتح وشکست کے منظر و پس منظر کے بیچ کھڑا ہے باہمی اعتماد کی فضا اور لطف کا استعارہ بن سکتا ہے۔''

(کشور ناہید، عورت مرد کا رشتہ، ص 245)

اس سمت میں نسائی فکر کے علمبرداروں، خواتین تنظیموں اور سوشل ورکروں کی بے پایاں محنت و مشقت سے بھی منظر نامے میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں اور خواتین کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ اس طبقے کی عورتوں نے اپنی شناخت بنانے کے حق پر زور دیا۔ ایسی شناخت جو ان کی ماؤں سے مختلف تھی، جو مردوں پر (خواہ وہ باپ ہوں یا شوہر) انحصار رکھنے والی مطیع وفرمانبردار لڑکیوں یا بیویوں کی حیثیت سے پلی بڑھی تھیں، اس نے اپنی خاموشی کو ختم کر کے اپنی فعالیت کا دعویٰ پیش کیا جواب خود اعتماد ہے۔ وہ خود کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ مرد اور پدرانہ نظام کے پھندے میں پھنسے۔ وہ ایک روشن خیال کے روپ میں برابر کا شہری ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے۔ ایک مارکسسٹ کے طور پر یک زوجیت کو جھوٹا ثابت کر رہی ہے اور عورتوں کو محکوم بنانے کے حربے سے روشناس بھی کرا رہی ہے۔ ایک انتہا پسند کے طور پر پدرانہ نظام میں جبلی طور پر موجودہ مردوں کی جنسی بالادستی کی سیاست کے خلاف جنگ کر رہی ہے۔ آج کی عورت کسی چیز کے حصول کے لیے اوروں کی محتاج نہیں ہے۔ اس نے مذہبی نظریے کو بھی چیلنج کیا اور اخلاقیات کی رسمی وروایتی تعریف کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

آج کی عورت محنت کش اور سرگرم ہے، بے بس نہیں ہے۔ یہ انصاف کی بھیک نہیں مانگتی ہے۔ بجائے اس کے یہ اپنے وقار وعظمت کے تئیں انتہائی حساس ہے بلکہ جوں جوں عورتوں کے حقوق اور ان کی معنویت کا اعتراف اور اس کے بارے میں شعور بڑھتا جا رہا ہے، اس کے نتیجے میں عورتوں کی مخالفت اور ان سے بدلہ لینے کا جذبہ بھی تقویت پا رہا ہے۔ اس طرح سے ان کی مخالفت کا ایک عبوری دور چل رہا ہے۔ یہ عورتوں کو با اختیار بنانے کی راہ میں بڑا چیلنج ہے۔ دوسرا بڑا چیلنج اس راستے کا یہ ہے کہ ابھی تک مردوں کی سوچ ایسی ہے کہ عورتیں کچھ شعبوں میں مردوں کی طرح کام کرنے کی اہل نہیں۔ لیکن عورت کی عزت نفس اور خود اعتمادی میں اس دور میں اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے وہ خاندان میں مساوات کا دعویٰ کر رہی ہے بلکہ ہر سطح پر خواہ وہ گھریلو معاملات ہوں، پبلک سیکٹر ہوں یا سرکاری ادارے ہوں، انفارمیشن ٹکنالوجی، بایوٹکنالوجی ہو یا اخبارات وجرائد ہر جگہ عورت نے چیلنج کے ساتھ مردوں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اب اپنے حقوق سے باخبر ہوگئی ہے اور معاشی خودمختاری پر قابو پانے کے لیے تمام منظم وغیر منظم سیکٹر میں ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ چند دہائیوں سے بھارت میں اخبارات و جرائد پر مردوں کا ہی تسلط تھا۔ محض معدودے چند خواتین اخبارات کے دفاتر میں جونیر عہدوں پر دکھائی دیتی تھیں اور خواتین کی دلچسپی والے موضوعات مثلاً فیشن، خانہ داری اور پرورش بچگان کے سیکشنوں میں کام کرتی تھیں۔ خاتون صحافی بھی زیادہ تر انھیں موضوعات پر طبع آزمائی کرتی تھیں۔ دفاتر میں عورتوں کو برائے آرائش رکھا جاتا تھا۔ اس لیے جسمانی خوبصورتی ان کی سب سے بڑی قابلیت تصور کی جاتی تھی ورنہ بیشتر عورتوں کی طاقت وتوانائی گھریلو معاملات پر ہی صرف ہوتی تھی۔ اخبارات واشتہارات میں انہی پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ لیکن 1980 کے بعد کے منظر نامے میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ گھر سے باہر کام کرنے والی خواتین کے اندر بیداری آئی اور اس نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا۔ اب وہ ان شعبوں میں بھی داخل ہوئی جو مردوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کوئی بھی کام جو مرد کرتا ہے، عورت بھی سنجیدگی سے انجام دے سکتی ہے۔ پھر کیا تھا اخبارات کے دروازے ان کے لیے کھل گئے اور ان میں وہ کام کرنے لگیں۔ چوں کہ ہمارے ملک میں زراعتی کام کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہے اور شہروں میں

بھی بڑی بڑی عمارتیں عورتوں کی مدد سے تعمیر کی جاتی ہیں۔اس لیے خواتین جرنلسٹوں کو عورتوں کا مرتبہ بلند کرنے اور ان کے تئیں سماج کا رویہ بدلنے کے لیے اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔

مختلف سرکاری محکموں اور غیر سرکاری اداروں میں بھی خواتین ذمہ دار عہدوں پر دیکھی جاسکتی ہیں جہاں انھیں اہم فیصلے بھی لینے پڑتے ہیں۔ خواتین آئی۔اے۔ایس، آئی۔پی۔ایس اور فارن سروس میں بھی قابل تعریف کام کر رہی ہیں۔خواتین کا ذریعہ آمدنی اب صرف درس وتدریس، نرسنگ اور علم الادویہ تک محدود نہیں رہا ہے۔خواہ ایڈورٹائزنگ کا شعبہ ہو یا آرٹس کا، فن تعمیر ہو یا قانون خواتین سبھی میدانوں میں اپنا لوہا منوا رہی ہیں۔غیر منظم سیکٹر میں خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ماضی میں انھیں مزدور یونینوں کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے تکالیف ومصائب کا شکار بننا پڑتا تھا لیکن شاید اب وہ مزدوروں کے ساتھ برابری کی راہ میں چل پڑی ہیں۔ سیاست میں بھی خواتین آگے ہیں۔حالیہ انتخابی اصلاحات اور خواتین کی ریزرویشن کے اہتمام کے بعد توقع کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں خاتون امیدواروں کے لیے حالات میں بہتری آئے گی۔لیکن 1980 کے بعد سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظرنامے میں نت نئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہر سطح پر بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔عورت کی حیثیت کل کی بہ نسبت آج زیادہ بہتر ہے لیکن عورت کو مزید باوقار، خودمختار وخود انحصار بنانے اور جانبداری ومحکومی سے نجات دلانے کے لیے متعدد خواتین تحریکیں اور تنظیمیں ثابت قدم ہیں۔ کیونکہ اتنی ترقی کے باوجود خانگی زندگی سے لے کر باہر کی زندگی تک مختلف جگہوں پر عورت کو جانبداری کا شکار ہونا پڑتا ہے، جس کو ختم کرنے کے لیے دنیا بھر کی عورتیں کوشاں ہیں۔سرکاری سطح پر بھی متعدد پالیسیاں وقوانین عورت کے بہتر مستقبل کے لیے خواہاں ہیں۔

اس سمت میں مشرق ومغرب تقریباً سب ہی ملکوں میں خواتین تنظیمیں، فلاحی ادارے، قانون دانوں کی انجمنیں ان ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں جو اب تک خواتین کی قسمت رہی ہیں۔ اس دور کی ادیبائیں، شاعرات، دانشور وفنکار سب ہی اس مسئلے پر اپنے ردعمل کا برملا اظہار کر رہی ہیں کہ معاشرے میں خواتین کا کیا مقام ہے اور کیا حقوق ہونے چاہیے۔ 90-80-1970 کی دہائی نے ہر لحاظ سے جدید عورت کو عورتوں کے گوناگوں مسائل وموضوعات، اس کے حسیات ومحسوسات کے اظہار کے لیے ایک سنہرا پلیٹ فارم تیار کیا۔90 کی دہائی میں کافی تعداد میں نیٹ ورکنگ اور تنظیموں کی بنیادیں ڈالی گئیں۔1995 میں بیجنگ میں خواتین پر بین الاقوامی اجلاس کا انعقاد خصوصاً قابل ذکر ہے۔اس میں ہندوستان کے ہر طبقہ، دیہاتی وشہری علاقوں کی عورتوں نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔اجلاس کے اغراض ومقاصد کو مستحکم بنانے کے لیے National Alliance of Indian Women کی داغ بیل ڈالی گئی۔

Women's Movement کے اثرات اور ثابت قدمی کی وجہ سے قومی سطح پر ''عورتوں کی ترقی'' اور عورتوں کے موضوعات کو مرکوز ومحور بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ ''قومی خواتین کمیشن'' کی بنیاد عورتوں کے ساتھ بھید بھاؤ اور امتیازانہ سلوک کو ختم کرنے اور انصاف دلانے کے لیے ڈالی گئی۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اپنے سبھی پروگراموں میں عورتوں کے جنس کے موضوعات کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔اتنی جدوجہد اور بے پناہ محنت ومشقت کے بعد آج عورتیں تمام شعبے میں نظر آنے لگی ہیں اور کسی حد تک جنسی اختلاف کی بنا پر ان کے ساتھ جانبداری کم برتی جارہی ہے۔آج کل مغربی ممالک کی طرح ہمارے ملک میں کوئی شعبہ اور کوئی پیشہ ایسا نہیں ملے گا جس میں اختلاف جنس کی بنیاد پر عورتوں کو شامل کرنے سے انکار کیا جارہا ہے۔مغربی ممالک میں عورتیں انڈسٹری، دفاتر اور ہر طرح کے کاموں کو کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ ہمارے ملک میں بعض دشواریوں اور تعلیمی سہولتوں کی عدم حصولیابی سے پورے طور پر ایسا نہیں ہو پا رہا ہے پھر بھی ہر شعبہ میں بکثرت عورتیں کام کر رہی ہیں۔ سائنسی تحقیقات، انجینئرنگ، میڈیکل اور قانون کے شعبوں میں بھی اب عورتوں کی کمی نہیں ہے۔مختلف میڈیکل کالجوں اور سائنسی تحقیق کے شعبوں میں عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کر رہی ہیں اور انھوں نے وہی اہمیت حاصل کر لی ہے جو مردوں کو حاصل ہے۔نئی تحریک آزادی نسواں جو ہیومن رائٹس کی مانگ کے ساتھ پیدا ہوئی ہے ایسی خاتون کا تصور دیتی ہے جو سر اٹھا کر جئے۔جدید عورت اس تحریک سے خاصا متاثر ہے، وہ ایک ایسی عورت کا خواب دیکھ رہی ہے جو ہر مسئلہ پر بات کر سکے۔اہم سے اہم ذمہ داری قبول کر سکے۔فنون لطیفہ سے لے کر سائنس وٹکنالوجی تک جس شعبے میں بھی دلچسپی اور رجحان ہو اس میں ناموری حاصل کر سکے۔

□□□

Dr. Shabnam Ara
Address : House No . 128
Flat No. 303, Gali No. 10
Zakir Nagar
New Delhi-110025
Mobile: 9971700520

ڈاکٹر توصیف احمد ڈار

خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں تانیثی فکر

عصر حاضر میں تانیثیت کی تحریک عالمی معنویت اختیار کر چکی ہے۔ اس تحریک کے مطابق خواتین زندگی اور معاملاتِ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی ہمراہ یکساں اور مساوی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ کئی جاہلانہ وجوہات کی بنا پر اس صنف نازک کو اُن تمام سیاسی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی وغیرہ حقوق سے محروم رکھا گیا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ عورت یہ سب کچھ چپ چاپ سہتی رہی یا اگر ہم یوں کہیں کہ اُسے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا تو بے جا نہ ہوگا۔ تانیثیت ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گئی ہے جس کا بنیادی منشا و مقصد عورت کو اس کے بنیادی حقوق کی فراہمی ہے۔ اس تحریک کی وساطت سے ہی اس سائنسی دور میں عورت زندگی کے دیگر شعبۂ جات کے ساتھ ساتھ شعر و ادب میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرتی ہے۔ اردو ادب میں تانیثی رجحان کی جھلک بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے نظر آنے لگی۔ یہ رجحان صرف طبقہ نسواں کے مسائل کے حوالے سے بحث نہیں کرتا بلکہ طبقہ حیات کے انتقادات اور اعتراضات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ادب میں خواتین کے مسائل اور حصولِ زندگی کے تئیں جو کچھ تحریر کیا گیا ان تمام نکات کو تانیثیت کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے یعنی اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ رجحان جہاں معاشرتی زندگی سنوارنے کا خواہاں ہے وہیں اس کے دوش بدوش حیات کے دونوں طبقوں (مرد و عورت) کو بہترین زندگی گزارنے کا لائحہ عمل بھی فراہم کرتا ہے۔ جہاں تک اردو افسانے میں تانیثیت کی روایت کا تعلق ہے تو اس کی باقاعدہ ابتداء ''انگارے'' کی اشاعت سے ہوئی۔ ''انگارے'' نے تانیثیت کا ایک مضبوط تر نظریہ اردو ادب میں پیش کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی یوں رقمطراز ہیں:

> ''جہاں تک اردو افسانے میں تانیثی رجحان کا تعلق ہے اس کا آغاز انگارے کی اشاعت ہی سے نظر آتا ہے یہ الگ بات ہے کہ 1932 میں جب انگارے کی اشاعت ہوئی تو اس کے پیچھے براہ راست تانیثیت کے اظہار کا نصب العین نہیں تھا مگر اردو افسانوی ادب میں ایک باغیانہ اور بے باکانہ اظہار کا پہلا قدم تھا جس نے آنے والے وقت میں تانیثیت کے لیے راہیں ہموار کیں۔''

(مشتاق احمد وانی: اردو ادب میں تانیثیت، عفیف پرنٹرس، دہلی، ص575)

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فکشن میں پہلی بار نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے خواتین خصوصاً مسلمان عورتوں کے حقوق مثلاً سماجی ،اخلاقی ،مذہبی اور معاشرتی مساوات کے حوالے سے بحث کی باقاعدہ شروعات کی ہے۔ناول کے بعد افسانہ نے ادب کی دنیا میں اپنی الگ شناخت قائم کی اور معاشرے میں پنپنے والے انگنت مسائل کو موضوع بنایا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو افسانہ ہر موضوع اور ہر رجحان کو خود اپنے آپ میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔تانیثیت کے اثرات بھی اردو افسانہ نے قبول کیے۔جیسا کہ مذکور ہوا ہے کہ افسانوں میں تانیثی فکر کے ابتدائی نقوش ''انگارے'' میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس مجموعے میں شامل افسانوں میں سب سے پہلے نسوانی رجحان کی جھلکیاں رشید جہاں کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔رشید جہاں وہ اوّلین نسوانیت کی علمبردار خاتون ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ عورت کے پردہ سے باہر نکلنے کی حمایت کی اور اس کے ذاتی حقوق کی پامالی کے خلاف آواز اٹھائی۔رشید جہاں کا تعلق صنفِ نازک سے ہونے کے باوجود بھی ،وہ جس بے باکی اور نڈرتا کے ساتھ خواتین کے مسائل کو سامنے لاکر مرد غالب معاشرے میں خواتین کی اہمیت اور قدر و قیمت اور ان کے جائز حقوق کے دفاع کو موضوع بنایا وہ اپنے آپ میں کمالِ فن کا مظاہرہ ہے۔ بقولِ قمر رئیس:

''اب تک اردو افسانے میں جو ناگفتی تھی۔گھریلو بول چال کی اس زبان کے سہارے رشید جہاں نے اسے گفتی بنادیا۔ ان کے فن کا کمال اس میں ہے کہ قاری کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ افسانوں کے ذریعے پردوں کے اندر رہنے والی ایک ایسی محدود دنیا کی وسعتوں کی سیر کر رہا ہے جس سے اردو افسانے کا دامن خالی ہے۔بعد میں اسی روایت کو عصمت چغتائی ،خدیجہ مستور ،ہاجرہ مسرور ،صدیقہ بیگم ،سجاد ظہیر اور دوسری افسانہ نگار خاتون نے آگے بڑھایا لیکن اس میدان میں رشید جہاں ،بہر حال ان کی پیش رو کہی جائیں گی۔''

(بحوالہ ،اردو ادب کو خواتین کی دین ،مشمولہ تحریک نسواں اور اردو ادب ،علی احمد فاطمی ،ص 167)

رشید جہاں وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے مرد اور عورت کے درمیان پنپنے والے مسائل کی بھرپور عکاسی کی۔انھوں نے خاص طور سے عورتوں کی سماجی حالت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔مرد اور عورت کے تئیں سماج میں جو نابرابری تھی ،اس کی شدید مزاحمت کی۔خواتین کی آزادی اور تعلیم کی حمایت کی اور اس بات پر زور دیا کہ خواتین کو مردوں کے برابر حقوق ملنے چاہیے۔ان کا افسانوی مجموعہ ''عورت و دیگر افسانے'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس میں شامل کم و بیش تما افسانے کسی نہ کسی صورت میں تانیثی فکر کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ان افسانوں کے مطالعے سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ مصنفہ نے معاشرے میں ایک عورت کو درپیش تمام مسائل و معاملات کی بڑی فن کاری سے ترجمانی کی ہے۔اس مجموعے میں مصنفہ نے ایک پڑھی لکھی اور سیاسی و سماجی فہم و ادراک کی حامل خاتون کی حیثیت سے مرد غالب معاشرے میں اپنی بقاء کی لڑائی لڑتی خاتون کی مظلومیت اور بے بسی کو خالصتاً نسائی نکتہ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اس افسانوی مجموعے کے حق میں رضوانہ لکھتی ہیں:

''رشید جہاں کا افسانوی مجموعہ ''عورت اور دیگر افسانے'' کے نام سے 1937 میں شائع ہوا جو ۹ افسانوں پر مشتمل ہے ان میں عورت کے مسائل کو سماجی ،معاشرتی اور مذہبی تناظر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔''

(1950 کے بعد اردو خواتین افسانہ نگار ،رضوانہ ،ص 99)

اس مجموعے میں شامل افسانوں میں مسلمانوں کے متوسط اور نچلے طبقے کی مسلمان عورتوں کی گھٹی ہوئی مجبوری و محکوم زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔وہ معاشرے کی ان تمام برائیوں کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جو خواتین کی زندگی کے لیے ناسور بنتے جارہے تھے۔جن کے اسباب میں کبھی جہالت ،کبھی گھسے پٹے رسم و رواج ،کبھی مردوں کے ذریعہ بے تحاشہ استحصال وغیرہ شامل ہے۔اس نوع کے فن پاروں میں افسانہ ''چھدا کی ماں'' اُن کا ایک اہم کارنامہ ہے۔اس افسانے میں قلم کار نے ساس اور بہو جیسے کرداروں کو تراش کر ایک مرد کے بجائے عورت کا عورت کے ہاتھوں استحصال کی ایک غور طلب تصویر پیش کی ہے کہ کس طرح ایک ہی جنس کے حامل دو کردار اپنی بالادستی اور جعلی لاج و عظمت کو برقرار رکھنے کی خاطر ایک دوسرے کی ہنستی کھیلتی زندگی کو جہنم میں بدل دیتے ہیں۔اس افسانے میں ادبی شعریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ایسے نازک مسئلے کو بڑی خوبصورتی سے تراشا گیا ہے ،جسے روزمرہ کا معمولی اور عام سا واقع متوقع کر کے بیشتر صرفِ نظر ہی کیا جاتا ہے ،لیکن اس کے افسانے کی سنجیدہ قرأت کے بعد قاری غیر محسوس انداز میں اس ظلم کے زد میں آنے والی روح کی المناکی سے واقف ہوکر اس طرز کے حادثات سے متنفر ہوجاتا ہے۔اس افسانے میں عورت کے اُس عمومی روّیے کی عکاسی ملتی ہے جب وہ ساس کا روپ اختیار کرلیتی ہے تو لاشعوری طور پر اسے اپنے گھر پر حکمرانی اور بیٹے کے چھن جانے کا ڈر لگا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہو بیٹے کی ذہنی ہم آہنگی اس کے لیے اذیت کا باعث بنتی ہے۔چھداں کی ماں بھی اپنے بیٹے

کی ازدواجی زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتی۔وہ اپنی بہو کو طرح طرح کی اذیتیوں کا شکار بنالیتی ہے۔بات بات پر اس سے لڑتی جھگڑتی ہے۔ساس تو ساس آخر اُس کا اپنا شوہر بھی اُس کے ساتھ غیر متوقع سلوک کرتا ہے۔وہ بھی اسے پیٹتا،ڈراتا دھمکاتا ہے۔افسانے سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''بڑھیا نے کئی دن سے ہر وقت چیخنا شروع کردیا تھا اور ہر وقت کی بُرائی اپنے لڑکے کی کرنے لگی تھی کبھی پکی پکائی دال میں نمک جھونک دیتی،کبھی روٹیوں پر جھوٹے ہاتھ مل دیتی ،کبھی کچھ کام بگارڈ دیتی کبھی کچھ۔جب لڑکے نے کچھ نہ کہا تو آج اس نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔جیسے ہی چھدا ان گھر میں گھسنے لگا تو بڑھیا نے بہو کو پیٹنا شروع کیا۔اور کہنے لگی کہ یہ چھنال۔۔۔۔عیدو سے ہنس رہی تھی''۔اس بات پر چھدا ان نے بھی نئی نئی بہو کو خوب پیٹا''

(افسانہ''چھداں کی ماں''مشمولہ''شعلہ''،نصرت پبلیشرز امین آباد لکھنو،ص37)

یہاں پر مصنفہ نے ان سماجی ناسوروں کی نشاندہی کی ہے جو عورت کو تشدد کا نشانہ بنا کر اپنی مردانگی کی تسکین کرتے ہیں۔عورت کو اپنی متاع، غلام اور دستِ نگراں سمجھتے ہوئے مارنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

خواتین کے مسائل پر لکھنا تحریک نسواں کی دین ہے اور اس تحریک میں بے باکی اور حقیقت پسندی کی رنگ آمیزش رشید جہاں کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ رشید جہاں کے بعد بہت سی خواتین افسانہ نگار سامنے آئیں جنھوں نے عورتوں کی آزادی،مساوات اور حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کی۔ان میں عصمت چغتائی ایک اہم نام ہے۔عصمت نے تانیثی حیثیت اور تانیثی شعور کے اظہار کے لیے اپنی زیادہ تر تحریروں میں قابل ستائش نمونے پیش کیے۔بقول ترنم ریاض:

''عصمت چغتائی کی تحریریں تانیثی ادب کا وہ پہلا سنگ میل ہیں جہاں سے مردوں کے عائد کردہ اصول اور صدیوں سے تیار کردہ فیصلوں کے خلاف یلغار کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ان کی تحریریں تانیثی شعور اور تانیثی کے اظہار کا پہلا تجربہ ہیں۔''

(بحوالہ:فکروتحقیق،افسانہ نمبر،اردو کی ادیبائیں:منظر پس منظر،ترنم ریاض،ص222)

ایک عورت ہونے کے ناتے عصمت چغتائی کو خواتین کی زندگی کے ہر گوشے پر گہری نظر تھی۔انھوں نے اردو افسانے میں پہلی بار سماج کی ڈری،مجبور اور بے بس عورت کو بولنا سکھایا۔بے میل کی شادی، بے جوڑ شادی،جنسی ناآسودگی،گھروں میں اس کا استحصال،سماج میں اس کی کم تر حیثیت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔اس دور کی تخلیقات میں چوتھی کا جوڑا،لحاف،چھوئی موئی،ایسے شاہکار افسانے شامل ہیں جن میں تانیثیت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔عصمت کی عظمت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جس بے باکی اور فن کارانہ انداز میں خواتین کو درپیش مسائل و معاملات کی تصویر کشی کی ہے وہ اُن سے قبل کسی تخلیق کار کے یہاں دیکھی جاسکتی ہے اور نہ ہی اُن کے بعد۔ہمارے معاشرے میں پنپ رہے ان گنت وباؤں میں سے ایک بڑی اور غریب طبقے سے وابستہ افراد بالخصوص غیر شادی شدہ عورتوں کے حق میں سب سے جان لیوا وبا ''جہیز کی بیہودہ رسم'' ہے۔یہ وبا اپنے آپ میں اس قدر بھیانک اور تباہ کن ہے کہ اس نے سماج کے ایک بہت بڑے طبقے کو اپنے حصار میں لے کر ان کے حسین و خوش آئند خواب تہس نہس کر کے رکھ دیے ہیں۔کثیر تعداد اُن عورتوں کی موجود ہے جو جہیز کے معیار پر پورا نہ اُتر کر اپنی تمام زندگی دوسروں کے سہارے گزارنے پر مجبور ہیں۔عصمت نے ادبی اور فنی اسلوبِ انداز اختیار کر کے اس رسمِ ناکارہ کے عبرتناک نتائج کو اپنی تحریروں کے ذریعے سامنے لایا ہے۔اس حوالے سے اُن کا مشہورِ عام افسانہ''چوتھی کا جوڑا'' قابل مطالعہ ہے۔یہ افسانہ تانیثی فکر کی تبلیغ کا ایک اہم دستاویز ہے۔اس میں مصنفہ نے عورت پر صدیوں سے سماجی جبر و استحصال کے ساتھ ساتھ ایک عورت کی دلبری،اُس کی بے لاگ محبت اور نرم دلی کا بھی متاثر کن خاکہ کھینچا ہے۔یہ افسانہ ایک ایسی لڑکی کی روداد ہے جو اس معاشرے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے جہاں غریب طبقے کی لڑکی صرف جہیز نہ دینے کی وجہ سے شادی کے پاک رشتے سے محروم رہتی ہے۔یہ مختصر افسانہ اپنے اندر درد و کرب سمیٹے ہوئے ہے اور ہمارے معاشرے کے غریب طبقے کی محرومیوں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔غریب ماں باپ کے لیے سب سے سنگین مسئلہ لڑکیوں کی شادی کا ہوتا ہے اور یہ سارا مسئلہ جہیز کی لعنت سے جُڑا ہوتا ہے جو کہ ایک لاعلاج مرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کے افسانے''چوتھی کا جوڑا'' کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں بالیاں بیناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال تول پر سفیدی کا نشان۔اس کی سرخی نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا ارمان رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے،اور پھر ایک دم سب خاموش ہوگئے۔بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کر توڑ لیا۔دو موٹے موٹے آنسوں کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے

دھیرے رینگنے لگے۔ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرادیں جیسے آج انہیں اطمنان ہوگیا کہ ان کی کبریٰ کا جوڑا بن کر تیار ہوگیا اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔''

(عصمت چغتائی۔افسانہ''چوتھی کا جوڑا''مشمولہ عصمت چغتائی کے 28 بہترین افسانے۔ص75)

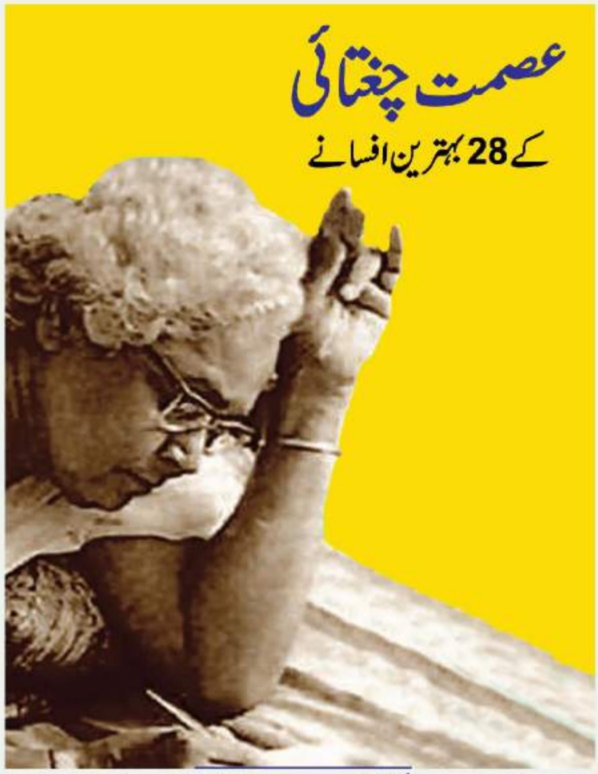

عصمت چغتائی کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ انھوں نے عورت کی انسانی حیثیت کو پہچانا۔عورت کی حیثیت کو مسخ کرنے والی ان گنت بندشوں اور حصاروں کو توڑنے کی کوشش کی اور بے مثل تحریروں کے ذریعے سماج میں پنپنے والے دقیانوسی رسم ورواج اور توہم پرستی کے خلاف احتجاج کیا۔ان کا افسانہ''سونے کا انڈا'' تانیثی فکر سے بھرا ہوا ایک اہم افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنفہ نے بڑے انہماک سے یہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک لڑکے کے برعکس ایک لڑکی کو زندگی کے ہر ایک معاملے اور ہر ایک سطح پر کمزور و کمتر جان کر حاشیے پر دھکیل دیا جاتا ہے،اسے اپنے بنیادی حقوق سے کس طرح پامال کیا جاتا ہے اور بنے بنائے رسم ورواج کی پاسداری میں ایک عورت کو کس قدر قدم قدم پر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ہمارے معاشرے میں جہاں لڑکے کی پیدائش پر چراغاں کیا جاتا ہے،خوشیاں منائی جاتی ہیں وہیں لڑکی کی پیدائش پر پورے خاندان پر صف ماتم بچھ جاتا ہے۔آج کا سماج بھی اس سے مختلف نہیں۔اگر چہ کسی حد تک بدلاؤ آگیا ہے تاہم پرانے خیالات سے وابستہ لوگ آج بھی لڑکی کی پیدائش باعث زحمت سمجھتے ہیں۔افسانہ''سونے کا انڈا'' کا یہ اقتباس:

''خدا کی ماران حرام زادیوں پر۔نگوڑیوں نے بندو میاں کا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔۔۔

دیوار کے اس پار صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔دہلیز پر بندو میاں پھسکڑا مارے بیٹھی نکمی بہو کی سات پشتو کو گالیاں دے رہی تھیں۔''موٹی ہیجڑوں کے خاندان کی۔۔۔لونڈیا نہ جنے گی تو اور کیا کرے گی۔''

(عصمت چغتائی۔افسانہ''سونے کا انڈا''مشمولہ عصمت چغتائی کے 28 بہترین افسانے ص299)

قرۃ العین حیدر اردو ادب سے وابستہ ایک ہمہ جہت و پہلو ادیبہ تھیں۔عصمت چغتائی کے ساتھ ہی اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ان کے یہاں نسوانی شعور وادراک اپنے غالب رجحان کے طور پر پایا جاتا ہے۔جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے:

''قرۃ العین حیدر نے عورت کے مقدر،اس کی مجبوری اور اس کے استحصال کو ترجیحی

طور پر اپنا موضوع بنایا۔اس رویے کو اگر ہم کسی شعوری کوشش کا نام نہ بھی دیں تب بھی اس رویے کے نتیجے میں سامنے آنے والے اس خام مواد کی قدر و قیمت femnist tren کے نقطہ نظر سے متعین کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔''(بحوالہ،محبوب حسن،نکات فکشن،ص42)

قرۃ العین نے اپنے ناولوں کے ساتھ ساتھ افسانوں میں بھی عورت اور عورت کی زندگی اور اس کے مسائل ، جذبات ، احساسات و محسوسات کی بھر پور ترجمانی کی ہے۔آپ کا مطالعہ کافی گہرا اور مشاہدہ نہایت وسیع تھا۔آپ کو بیک وقت کئی زبانوں کے فکروفن سے بہ تمام وکمال واقفیت حاصل تھی۔کئی ایک مشرقی و مغربی تحریکات ورجحان کا کافی وشافی تجربہ آپ کو حاصل تھا۔ان خوبیوں کے تئیں آپ نے جس کسی بھی موضوع کو بھی اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے اس کو اپنے تمام تر جزئیات کے ساتھ سامنے لانے میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔افسانہ''یادوں کی ایک دھنک جلے'' آپ کے طویل افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے جس میں مصنفہ نے گریسی نام کی ایک عورت ، جو کم تعلیم یافتہ تو ہے مگر خلوص ومحبت کا پیکر ہے ،کو مرکزی کردار کے بطور پیش کر کے عورت کی مجبوری ومحکومی کی عمدہ تصویر پیش کی ہے۔گریسی کا شوہر اسے عنفوانِ شباب میں ہی داغِ مفارقت دے

جاتا ہے اور وہ اس گھر میں، جو اس کی خوشیوں اور امنگوں کا مسکن تھا، ایک زندہ لاش اور بے وقعت وجود کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ اگرچہ اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لا کر اس گھر کے بقیہ تمام افراد کو خوش رکھتی ہے، اُن کی دل و جان سے خدمت کرتی ہے اور اُن کی تمام اُداسیوں اور تنہائیوں کو دور کرتی ہے لیکن اپنی باطنی کیفیات کو کسی بھی طرح تبدیل نہیں کر سکتی ہے۔

''گریسی گہری سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی کی ٹھیس کی اڑتیس سالہ محنتی اور وفادار عورت تھی۔ وہ بیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی اور دس برس تک اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ناصر چچا کے یہاں نوکر ہو گئی تھی اور آٹھ سال قبل جب سعیدہ چچی کلکتے سے ممبئی آئی تھیں، تب سے وہ ان کے پاس ملازم تھی، ان کی آخری بیماری میں گریسی نے دن رات ایک کر کے ان کی خدمت کی تھی اور ان کے انتقال کے بعد سے علی اصغر کو بے حد دلسوزی سے پال رہی تھی اور اس پر جان چھڑکتی تھی۔''

(قرۃ العین حیدر: یادوں کی ایک دھنک جلے، مشمولہ افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز''، ص93)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کے اندر صبر و تحمل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی خوشیوں کی خاطر اپنی خوشیاں قربان کرنے سے ذرا بھی دریغ نہیں کرتی۔ گریسی شوہر کے انتقال کے بعد بھی اس گھر کے ساتھ وہی محبت اور اُنس رکھتی ہے اور اس گھر اور اس کے افراد کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی نہیں برتتی ہے۔ اگرچہ ناصر چچا کو گریسی کی قربانیوں کا احساس ہے اور وہ اسے (گریسی) کو زوجیت میں بھی لے لیتا ہے مگر ناصر کا بیٹا اصغر، گریسی کو اپنی ماں کا درجہ نہیں دیتا اور ناصر چچا کے انتقال کے بعد اصغر اسے (گریسی) کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیتا ہے:

''گریسی چچی جانے کہاں گئیں؟ ممبئی واپس آ گئیں یا گوا چلی گئیں یا کہاں ہو گئیں۔ دنیا بہت بڑی ہے اور گریسی چچی ایک بہت گمنام، غیر اہم بوڑھی عورت تھی۔''

(قرۃ العین حیدر: یادوں کی ایک دھنک جلے، مشمولہ افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز''، ص131)

قرۃ العین حیدر معاشرے کی اصلاح چاہتی ہیں۔ وہ ایسی اصلاح کی خواہشمند ہیں جس سے مرد اور عورت دونوں کندھے سے کندھا ملا کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت نہ صرف ذہنی اعتبار سے مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کی لیاقت رکھ سکتی ہے بلکہ بعض موقعوں پر ان سے سبقت بھی لے سکتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عورت کو گھر کی چار دیواری میں محض بچہ پیدا کرنے کے لیے یا مرد کے ظلم و ستم کو سہنے والی کمزور عورت کے روپ میں پیش نہیں کرتی بلکہ ان کے یہاں موجودہ دور کی عورت کا کردار اور اس کے مسائل نمایاں ہوتے ہیں اور بعض اوقات خواتین کی دوسری طرح کی پیچیدگیاں اور دشواریاں بیان کی گئی ہیں۔ جیسے:

''ہاں تو ذرا اس جفا کار سماج کے مظالم پر غور کرو جو بے کس صنف نازک پر نہیں بھئی، یہ بھی نہیں، کچھ اور سوچنا چاہیے۔ ہاں خوب یاد آیا قوم قوم ہماری کس تیزی سے قعرِ پستی میں گری جا رہی ہے۔ اس ڈوبتی نیا کو کوئی پار لگانے والا نہیں۔ ہائے قوم۔ وائے قوم۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ۔۔۔۔۔۔ بہنو آؤ اور میدانِ عمل میں کود کر شاہراہ ترقی پر گامزن ہو جاؤ۔''

(آئینہ جہاں (جلد چہارم) مرتب جمیل اختر، ص104)

تانیثی نقطہ نظر سے قرۃ العین نے اپنے افسانوں میں خواتین کی بہتر سماجی حیثیت پر زور دیا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں ایسا مثالی نظام قائم کرتی ہیں جس میں عورت کو مساوی حقوق حاصل ہوں یہی وجہ ہے کہ ان کو تانیثی فکر کے اہم نظریہ سازوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تانیثی ادب کے معماروں میں ایک اور معتبر نام جیلانی بانو کا ہے۔ انھوں نے تانیثی رجحان کے حوالے سے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات اسی فکری میلان کے گرد رقصاں نظر آتی ہیں۔ وہ معتدل ذہنیت کی مصنفہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں تانیثی فکر کے موضوعات کی پیش کش کے حوالے سے کسی بھی طرح کی جذباتی سطحیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آپ فنی اوضاع کا لحاظ رکھتے ہوئے نازک سے نازک موضوع کو بھی غیر معمولی انداز میں صفحۂ قرطاس پر اُتارنے میں کمال رکھتی ہیں۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر آپ کے افسانے فکری و فنی اعتبار سے اعلیٰ آرٹ کے نمونے قرار پاتے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے ان کے افسانے ''موم کی مریم'' پر نظر ڈالیں تو اس میں انھوں نے عورت کی بے بسی کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ اس افسانے میں جیلانی بانو نے سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے کی ہیروین قدسیہ ہے، جو اپنی مرضی سے شادی کرتی ہے مگر اس کی ازدواجی زندگی ناکام رہتی ہے۔ قدسیہ کا شوہر ایک جگہ کہتا ہے:

''قدسیہ کے بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے وہ بڑی بدنصیب لڑکی ہے میں سچ مچ بہت ہی برا ہوں اور قدسیہ کو

فریب دے کر بھی نقصان میں رہوں گا۔''

جیلانی بانو نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ حالات اور حادثات کی وجہ سے اس راستے پر چل پڑی۔ اس معاشرہ نے اس باغی لڑکی پر ہی سارے الزام لگائے اور ان کے خلاف کسی نے اپنے ہونٹ تک ہلانے کی جرأت نہ کی جنھوں نے اسے قدم قدم پر فریب دیا۔ انھوں نے عورت کے درد و کرب کی مصوری بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ جیلانی بانو لکھتی ہیں:

''تمہارا اور اندھیرے کا ساتھ ہمیشہ رہا ہے تم جہاں جہاں بھی گئیں چراغ گل ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھر میں لیتے گئے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصور نور کا حالہ کھینچ دیتا ہے۔ تقدس اور معنویت کی لکیریں! جن کے اندر مریم کی روح کو محصور کر دیا گیا ہے۔ اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اُجالے کی اُمید قائم رکھی ہے۔''

(بحوالہ 1850 کے بعد اردو کی خواتین افسانہ نگار، از ڈاکٹر رضوانہ۔ ص131)

اردو کی ایک اور کہنہ مشق اور صاحب اسلوب افسانہ نگار خدیجہ مستور کے افسانوں اور ناولوں میں تانیثی رجحان کی شدت ملتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی تحریر کیا اس میں سماج اور خاص طور سے عورتوں کے مسائل کی بڑی عرق ریزی سے عکاسی کی گئی جو ان کے افسانوں کی پہچان رہی ہے۔ بقول مشتاق احمد وانی:

'' خدیجہ مستور نے مردوں کی اس کائنات میں بحیثیت خاتون قدم رکھا تو انھوں نے ''عورت'' کی آزادی اور اس کے حقوق کے مطالبات کا نعرہ بلند آواز میں لگانے کے بر خلاف انتہائی نرم، سبک اور مدھم آواز میں بالکل عین مردوں کے انداز میں تانیثیت کی وکالت کی اور عورت ہونے کی حیثیت عورت کی نفسیات اور اس کی داخلی دنیا کو سمجھتے ہوئے اُس کے جذبات واحساسات انتہائی غیر محسوس طریقے پر دُنیا کے سامنے پیش کیا انہیں اپنے اس تخلیقی عمل میں کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی بلکہ وہ عورت کی وجودی اہمیت سے واقفیت حاصل کر گئیں۔''

(مشتاق احمد وانی: اردو ادب میں تانیثیت، عفیف پرنٹرس، دہلی۔ ص515)

عصر حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں تانیثی احتجاج کی واضح شناخت ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں ملتی ہے۔ ذکیہ مشہدی دورِ حاضر کی حساس اور منجھی ہوئی ادیبہ ہیں۔ ذکیہ مشہدی نے اپنے عہد کی عورت، اس کے معاشرتی انسلاکات اور اس کے روزمرہ کے گزرے لمحات کو صحیح ادبی تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں جو نسوانی کردار تراشے ہیں وہ بیک وقت اپنی ذات کی نمائندگی کے علاوہ اپنے معاشرے کی بھی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ خواتین کے مسائل کا فہم و ادراک ہی نہیں عرفان بھی رکھتی ہیں۔ انھوں نے خواتین کے ان مسائل کو نمایاں کیا ہے جو مسلم معاشرے میں اور اس معاشرے کی گھٹن میں اس عہد کی عورت پر گزر رہے ہیں۔ اس کی خوبصورت مثالیں ان کے افسانے ''پرائے چہرے''، ''ایک تھکی ہوئی عورت''، ''چرایا ہوا سکھ'' میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اشرف جہاں نے خواتین کی معاشرتی زندگی اور ان کے ساتھ کیے گئے استحصال کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں عورت ذات کی شناخت کی متمنی ہیں۔ عورت کی عظمت کو مختلف زاویوں اور متنوع رنگ و روپ میں پرکھ کر اپنے افسانوں کے ذریعے قارئین کے سامنے لاتی ہیں۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ:

''یہ سچ ہے کہ آج بھی اس سماج میں عورتوں کا طرح طرح سے استحصال ہو رہا ہے۔ آج بھی انہیں وہ مقام نہیں ملا جو انہیں ملنا چاہئے۔ عورتوں کے تحفظ کا مسئلہ، شادی بیاہ کا مسئلہ، جہیز کے لین دین کا مسئلہ آج بھی کسی دیوزاد کی طرح سامنے کھڑا ہے اور عورتیں اپنی شناخت کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں، لیکن آج بھی ان کا کہیں جنسی استحصال کہیں معاشی استحصال کہیں سماجی استحصال کیا جا رہا ہے۔''

(افسانوی مجموعہ، شناخت، اشرف جہاں، پیش لفظ ص6)

اشرف جہاں نے خواتین کے تحفظ کے مسئلے کو نہایت ہی خوبصورت انداز سے اپنے افسانوں میں اٹھایا ہے۔ آج بھی لوگوں میں اتنا شعور و فہم ہونے کے باوجود بھی خواتین کا جنسی، معاشی، اور سماجی استحصال ہو رہا ہے۔ اشرف جہاں کے افسانوں میں اس طرح کے واقعات اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں خواتین کے استحصال کی کوئی نہ کوئی صورت نظر آ ہی جاتی ہے۔ افسانہ ''موم کی مریم'' میں ناصر اور شبیہ کی عمروں میں حد سے زیادہ تفاوت کے باوجود ناصر شبیہ سے شادی صرف اس لیے کرتا ہے تا کہ وہ جنسی درندگی سے محفوظ رہے گی۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ ''موم کی مریم'' کا یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''میں نے تمھیں اس ولدل میں گرتا دیکھا تو بچانا چاہا۔ میری عمر اور تمہاری عمر میں کافی تضاد تھا۔ میں سوائے نکاح کے اور کون سا راستہ اختیار کرتا تا کہ تمہاری حفاظت ہو سکے

اور بہت سوچنے کے بعد میں نے وہی کیا۔اب میں نے تمہارے لیے تمہارے مطابق لڑکا ڈھونڈ لیا ہے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔جانتی ہو وہ کون ہے؟۔۔۔۔۔ڈاکٹر حامد۔ تم تو اس سے مل بھی چکی ہو میں نے اسے یقین دلایا کہ تم مریم کی طرح پاکیزہ ہو۔وہ نکاح صرف تمہاری حفاظت کے لیے تھا اور جانتی ہو،حامد میری باتوں پر یقین کرتا ہے۔میں تین طلاق دے کر اسے بیاہ دوں گا۔''

(اشرف جہاں:افسانہ''موم کی مریم''مشمولہ افسانوی مجموعہ''شناخت''۔ص15)

عنبری رحمٰن کا افسانہ''آخر میں بھی ایک انسان ہوں''میں عورت کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔چمپا جو اپنے سسرال میں نہ صرف شوہر کی خدمت کرتی ہے بلکہ ایک ماں کی طرح شوہر کے بھائیوں کی بھی پرورش کرتی ہے۔اور ان سب میں چمپا ماں بننے کے احساس کو بھول جاتی ہے۔ماں بننا عورت کے خواب کی محض تکمیل ہی نہیں بلکہ اپنے نسائی وجود کو مکمل ہونے کا مسرت بخش احساس بھی ہے۔لیکن اس افسانے میں چمپا دوسروں کے چہروں پر خوشی لانے کی خاطر ماں بننے کے خواب کو شرمندہ تعبیر نہ بنا سکی۔اسے گھر میں دیوی کا روپ دیا جاتا ہے لیکن وہ جس پیار ومحبت کی متلاشی تھی وہ کبھی نہیں ملا۔یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''یہ لفظ چمپا کو آج کسی گندی گالی کی طرح لگ رہا تھا۔وہ پہلی بار چیخ سی پڑی تھی۔''مت کہیں ہمیں دیوی''۔دیویاں تو پرستش کے لیے بنتی ہیں اور ان کی تخلیق بھی پتھروں سے ہوتی ہے،جن کے سینے میں جذبات یا دل نہیں ہوتے۔میں ایک انسان ہوں،ہارٹس مانس کی بنی انسان،جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے اور سوچنے کے لیے ایک دماغ۔۔۔آپ بھگوان کے لیے مجھے سیوی کا درجہ نہ دیں،ایک انسان ہی بنا رہنے دیں کیونکہ دیویوں کو آدر اور پوجا کی ضرورت ہے مگر انسان کو زندہ رہنے کے لیے محبت اور چاہت چاہیے۔''

(بحوالہ عنبری رحمٰن کے افسانوں میں تانیثی حیثیت،از شیخ عقیل احمد۔ص330)

اس اقتباس سے یہ مترشح ہوجاتا ہے کہ عورت،عورت ہی رہنا چاہتی ہے۔اس کے اندر بھی جذبات واحساسات کا دریا موجزن رہتا ہے کہ کوئی اسے محبت کرے،اس کے ہونے کا احساس دلائے،اس کی چھوٹی سی چھوٹی خوشی کا خیال رکھے۔کیا صرف اسی کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی خوشیوں کو دوسروں کے لیے قربان کرے۔یہاں پر مصنفہ مرد طبقے کو اس بات کا احساس دلانا چاہتی ہے کہ جس طرح عورت اس کی خوشیوں کا خیال رکھتی ہے اسی طرح مرد پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عورت کو بھی اس کی خوشیوں کو لوٹانے میں کوئی کوتاہی نہ برتے۔اگر ایسا نہ ہوگا تو اس کا وجود شکستہ ہو کر بکھرنے لگے گا۔

ترنم ریاض عصر حاضر کی اہم نسوانی افسانہ نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ان کے افسانوں میں عورت کے جذبات واحساسات،ان پر ظلم وستم،محرومیاں،آنسو اور درد وکرب کا تذکرہ بار بار آتا ہے۔مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں مرد کی ہر غلطی عورت کی ہی ہوتی ہے۔حاکمیت کا نشہ مرد پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ عورت کو انسان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے،جو بات خلافِ طبع محسوس ہوتی ہے،اسے حکم عدولی،مزاج ناآشنائی اور روّے کی بدصورتی پر محمول کر کے انتقامی رویہ اختیار کرتے ہوئے عورت کو غم وغصے کا نشانہ بناتا ہے۔مرد اور عورت بہ حیثیت شریکِ حیات کے ایک دوسرے کو نظر انداز نہ کریں۔افسانہ''ناخدا''اس کی عمدہ مثال ہے۔یہ افسانہ خواتین کے گھریلو مسائل اور ازدواجی زندگی کی دشواریوں کا غماز ہے۔جیسے:

''پھر وہی بے چارگی اور وہی میرے شوہر کا روّیہ۔وہی میرا اندھیرے میں گھر کے باہر کی سیڑھی پر انتظار کرنا اور ان کا رات کے دوسرے پہر آنا۔وہی بے قاعدگیِ زندگی اور وہی بے وقت کا کھانا پینا۔میرا محبت اور آس بھری نظریں ان کے آگے پیچھے گھومنا ان کا اکھڑا اکھڑا باتیں کرنا اور میری دس دس باتوں کے جواب میں کبھی ایک بات کر لینا اور کبھی بولنا ہی نہیں۔میرا سراپا مجبور اور ان کی غرور سے تنی گردن۔''

(ترنم ریاض:افسانہ''ناخدا''۔مشمولہ افسانوی مجموعہ''یہ تنگ زمین''۔ص101)

الغرض مذکورہ خواتین افسانہ نگاروں نے براہ راست تانیثی رجحان اور اپنے منفرد لب ولہجے میں مردانہ بالادستی سماجی نظام کی کمزوریوں،عورت کے ساتھ مرد کا غیر منصفانہ رویہ،عورت کی مجبوریاں مسائل اور احساسات وجذبات کو قلم بند کیا ہے۔ان کے علاوہ عصرِ حاضر کی دیگر خواتین تخلیق کاروں میں تبسم فاطمہ،قمر جہاں،واجدہ تبسم،وغیرہ کی تحریروں میں تانیثیت ایک مستحکم ادبی نظریے کے بطور روشناس ہوا ہے۔

□□□

Dr. Towseef Ahmad Dar
Assistant Prof. Urdu (Contractual)
DDE, University of Kashmir
Hazratbal, Srinagar-190006 (J&K)
Mob: 9622543998

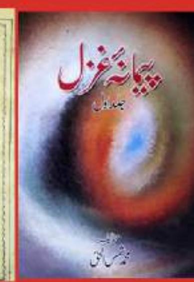

ڈاکٹر سلمیٰ رفیق

ماہ لقا چندا کا رنگِ تغزل

اورنگ آباد جو شمال اور جنوب کا سنگم رہا ہے۔ ہر دور میں یہاں نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں اور جو لوگ باہر سے آئے وہ بھی اس کی تہذیب و تمدن میں اس طرح رچ بس گئے کہ ان کی شناخت کرنا آسان نہیں رہا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری دور میں جب آصف جاہی حکومت قائم ہوئی اور ایک بار پھر دکنی تمدن نکھرنے لگا اور جہاں امرا اور رؤسا کی قد آور شخصیتیں سامنے آئیں وہیں شعر و ادب کی رونقیں بھی اپنے کمال کو پہنچیں۔ اسی ماحول کا غالباً نتیجہ تھا جس میں ماہ لقا جیسی شاعرہ اپنے تمام تر جمال و کمال کے ساتھ ابھریں۔ ماہ لقا کو ایک عرصے تک پہلی صاحب دیوان شاعرہ تسلیم کیا گیا۔ محمد عبدالحی نے ''تذکرہ شمیم سخن میں، فصیح الدین بلخی نے ''تذکرہ نسوان ہند'' میں اور فصیح الدین رنج نے ''بہارستان ناز'' میں انھیں اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لکھا ہے۔ بعد کی تحقیق نے ثابت کر دیا کہ پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز ہیں اگرچہ یہ اولیت صرف ایک سال کی ہے پھر بھی ان کا شمار صفحہ اول پر لکھا جائے گا۔ اس طرح ماہ لقا دوسری صاحبِ دیوان شاعرہ قرار پائیں۔ دکن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ پہلا صاحبِ دیوان شاعر اور پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ اسی خطہ ارضی میں پیدا ہوئے۔ ماہ لقا کی تعلیم و تربیت اور نشو نما اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں اورنگ آباد میں ہوئی لیکن عروج و کمال انیسویں صدی کے ربع اول میں حیدر آباد میں اس وقت ہوا جب آصف جاہی حکومت کو استحکام ملا۔

مولوی غلام صمدانی خان گوہر کی تحقیق کے مطابق ماہ لقا چندا 1767 میں پیدا ہوئیں اور 1824 میں وفات پائی۔ مولوی غلام صمدانی خان گوہر لکھتے ہیں کہ:

'' دیوان چندا مخزونہ سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مخطوطات مشرقی عہد نظام علی خان میں مرتب ہوا تھا۔ اس زمانے میں ارسطو جاہ مدارالمہام سلطنت آصفیہ تھے۔ یہ دیوان دراصل راجہ اور نبھا کی ایما پر سید نصیر الدین خان قدرت نے مرتب کیا تھا اور ماہ لقا کی خواہش پر طویل دیباچہ بھی لکھا تھا۔ ارسطو جاہ نے اس دیوان کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ دیوان کے مرتب ہونے کا سنہ ''ھواللطیف الاعظم'' 1213ھ سے برآمد ہوتا ہے۔ یہی وہ نسخہ تھا جس کو ایک تقریب میں ماہ لقا نے کپتان مالکم کو بتاریخ یکم اکتوبر 1799 یکم جمادی الاول 1214ھ کو نذر کیا تھا۔ اس نسخہ میں ایک سو پچیس (125) غزلیں ہیں۔۔۔۔۔'' (حیات ماہ لقا، مولوی غلام صمدانی خان گوہر، نظام المطابع، حیدر آباد (دکن)، 1906، ص:121)

ماہ لقا کا زمانہ اردو زبان کے لیے ارتقائی دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جب شمال میں میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، میر درد اور شاہ نصیر وغیرہ اردو کو معیار اور وقار عطا کر رہے تھے، اور دکن میں میر ذوالفقار علی صفا اور مرزا علی لطف اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ ماہ لقا کے سوانحی حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلند پایہ شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات سے بھی استفادہ کرتی تھیں۔ اسی طرح اس دور کے علمی اور ادبی ماحول نے بھی ماہ لقا کی جبلی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ان کی غزلوں میں ان کا اپنا منفرد مقام اور اعلی شاعرانہ خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں اگرچہ رنگ و آہنگ میں اس دور کا مروجہ مزاج جھلکتا ہے اور حسن و عشق کے معاملات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ماہ لقا کی غزلوں کے موضوعات عموماً وہی ہیں جو اس دور میں رائج تھے لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ ماہ لقا نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ غزل کی تکنیک کو برتا ہے وہ انھیں اس دور کی خواتین شاعرات میں ممتاز کرتی ہے۔ لیکن غالباً ان کے نام کے ساتھ طوائف لفظ نے بھی ان کے مقام و مرتبہ پر قدغن لگائی۔ محمد عبدالحی لکھتے ہیں کہ:

''چندا طوائف باشندۂ دکن عالمگیر ثانی بادشاہ دہلی کے عہد میں تھیں۔ شیر محمد خان ایمان سے مشورۂ سخن رکھتی تھیں۔ تیر اندازی و نیزہ بازی میں مثل مذکور کے مہارات کامل رکھتیں اور شعرا کی قدر کرتی تھیں۔ کئی سو سپاہی اور چند شاعر اس کے نوکر تھے۔ عورتوں میں سب سے پہلے اردو میں اسی عورت نے اپنا دیوان جمع کیا تھا۔۔۔''

(تذکرہ شمیم سخن، محمد عبدالحیی، منشی نول کشور، لکھنو، 1891، ص:8)

اسی طرح فصیح الدین بلخی کا بیان ملاحظہ کیجیے:

''بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے تذکرہ میں کوتاہ قلمی سے کام لیا ہے۔ مثلاً مولف ''سخن شعرا'' نے اس کو حیدر آباد کی طوائف اور شاعرہ لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اور اسی طرح دوسرے تذکروں میں بھی اس کا ذکر محض اختصار کے ساتھ ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیات کا کمتر ذکر کیا ہے۔''

(تذکرہ نسوان ہند، فصیح الدین بلخی، شمسی پریس، پٹنہ سٹی۔1956، ص:22)

اسی زمین میں ایک غزل ماہ لقا چندا نے بھی لکھی تھی جس کا مطلع ہے۔

ہلال مہ نو کو کم دیکھتے ہیں
وہ ابرو کا تیرے جو خم دیکھتے ہیں

ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادب میں اس دور کے واقعات اور تاریخی شواہد موجود ہوتے ہیں جس کے باعث وہ ادب پارہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ماہ لقا چندا کے مختصر دیوان میں بھی ہمیں اس دور کی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ارسطو جاہ کا ذکر دو بار ملتا ہے۔ ایک جگہ اس کی مدح سرائی ہے جہاں قصیدہ کا رنگ معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

رہے نو روز عشرت آفریں جوش بہار افزا
گل افشاں ہے تیرا چمن میں دہر کے ہر جا
نہ پوچھو کوئی عیش و خرمی کو عہد میں اس کی
کہ جس کے فیض سے گھر گھر ہے دور ساغر صہبا
ارسطو جاہ وہ فرخ نژاد اہل عالم ہے
کہ جس کے فضل و بخشش کا جہاں میں ہے علم برپا

اسی طرح یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

کسری سے لے کر آج تلک چشم دہر
میں دیکھا نہ تجھ سا اور کوئی اہل جاہ شوخ

نظام الدولہ آصف جاہ کی کرم فرمائیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو رستم دوراں سے تعبیر کیا ہے اور ان کی قدر دانی کا اعتراف ان اشعار میں کیا ہے۔

سخاوت میں کوئی ہم سر نہ ہوا اس کا زمانہ میں
وہی کرتا ہے پورا جس کے دل میں جو ارادہ ہے
خضر کی عمر ہو اس کی تصدق سے ایمہ کے
نظام الدولہ آصف جاہ جو سب کا مسیحا ہے
سدا پلتے ہیں چندا سے ہزاروں جس کے سایہ میں
نظام الدولہ و شاہ دکن ہے رستم دوراں

ماہ لقا نے انعام اللہ یقین کے طرز پر اپنی غزلوں کو پانچ اشعار تک ہی محدود رکھا۔ پانچ اشعار کی قید سے ان کی مذہبی عقیدت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ علیؑ سے عقیدت غالباً ماہ لقا چندا کے دیوان کا سب سے نمایاں عنصر ہے۔ سات غزلوں کو چھوڑ کر باقی ساری غزلوں کے مقطعے منقبت کے ہیں حضرت علی سے عقیدت مادی اور روحانی دونوں ہے۔ وہ اپنی دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں میں حضرت علی کے وسیلہ کی طلبگار ہیں۔

گنج کرم سے بخشے مولا کچھ اس قدر
چندا کو ہو نہ پھر کسی زردار کی تلاش

حضرت علی ہی چندا کا دین و ایمان سب کچھ تھے۔ انھیں سے انھیں اپنی ساری زندگی کا لطف محسوس ہوتا تھا۔

یا علی تم سے ہے چندا کو یہ امید قوی
دین و دنیا میں رہے لطف سے آرام کے بیچ

ماہ لقا نے سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ پورے دیوان کے مطالعہ سے بھی کہیں پیچیدگی اور ابہام کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں موسیقی اور ترنم کا عنصر نمایاں ہے۔ بہت سی بحریں غنائیت سے بھرپور ہیں اسی باعث دل ودماغ پر اچھا اثر چھوڑتی ہیں۔

گل کے ہونے کی توقع میں جیے بیٹھی ہے
ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے

عشق الٰہی یا تصوف کے رموز جہاں ہمیں اس دور میں میر درد کے یہاں اپنے عروج پر ملتے ہیں وہیں ماہ لقا کے مختصر سے غزلیہ دیوان میں بھی اس کی اچھی مثالیں مل جاتی ہیں ماہ لقا کی غزلیں افکار عالیہ سے بھرپور ہیں۔ عشق کے جذبے کو وہ بہت اعلیٰ مقام پر رکھتی ہیں۔ مقام الوہیت کی شناخت کے لیے یہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں تصوف کے نادر افکار پوشیدہ ہیں۔

غور کیجیے تو ہیں پر نور جمادات و نبات
یہ تیرے جلوے کا ہے ذات بشر میں غوطہ
ادا شرط عبادت ہو سکے ہے کب بھلا اس کی
خودی کو اپنی جب بھولے خدا کی یاد تک پہنچے
بجز حق کے نہیں ہے غیر سے ہرگز توقع کچھ
مگر دنیا کے لوگوں میں مجھے ہے پیار سے مطلب

ماہ لقا نے محاوروں اور ضرب الامثال کا برمحل استعمال کیا ہے۔ خواتین کی عام بول چال کی زبان میں جس طرح محاوروں کا استعمال کیا ہے وہ اس دور کے نسوانی لب ولہجہ کی ترجمان ہیں۔ بے ساختگی اور برمحل استعمال ان کی غزلوں کا اہم عنصر ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ۔

ہم جو شب کو نا گہاں اس شوخ کے پالے پڑے
دل تو جاتا ہی رہا اب جان کے لالے پڑے
کیوں طبیب اب نہیں کرتا ہے علاج دل ریش
کیا خوش آئی ہے ترے جی میں یہ بیمار کی طرح

صنعتوں کا استعمال بھی خوب خوب کیا ہے۔ ان کے کلام میں ہمیں صنعتوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ملتا ہے۔

نامہ بریوں ہے تیری راہ میں بلقیس ہے چشم
دیوے جس طرح سے ہدہد سلیماں کو کاغذ
سو بار سنا جشن بھی جمشید کا ہم نے
لیکن نہیں دیکھا تیری محفل کے برابر
جو دیکھا یار کے عارض پہ میں نے خال تاباں کو
کہی پھبتی کہ یہ ہندو کرے ہے حفظ قرآن کو

اسی طرح سے شاعری میں پیکر تراشی کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ چندا کے مختصر سے دیوان میں پیکر تراشی کی بھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

باہر جو نکلے برقع سے وہ روئے آتشیں
چادر میں ابر کے وہیں منہ چھپائے برق

یہ شعر بھی پیکر تراشی کا اچھا نمونہ ہے۔

تان کر ابروئے خمدار کو مت دیکھو ادھر
ڈرنے والے نہیں ظالم تیری تلوار سے ہم

بیان کی ندرت اور انوکھا پن بھی ماہ لقا کی غزلوں کی ایک خاصیت ہے۔ یہی ندرت اور انوکھا پن شاعر کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ غالب کو غالب اس کے کلام کی ندرت نے ہی رکھا ہے۔

رہا ہم درس ہوں اس مدرسہ میں عشق کے برسوں
سبق تھا وامق و عذرا کا وہاں طفل دبستاں کو
انگور کا دانہ ہے ہر اک آبلۂ پا
طے ہوتے ہیں کس لطف سے فرنگ خرابات
دل کو جوان بتوں سے کوئی آشنا کرے
تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو

اپنی خوبیوں اور خامیوں سے انسان بذات خود جتنا واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوسکتا ہے۔ اردو شاعری میں اپنی خوبیوں کا بیان اور تعلّی کی روایت بہت پرانی بھی ہے اور مستحکم بھی۔ ماہ لقا چندا کو بھی بجا طور پر اپنی شاعرانہ خوبیوں کا احساس تھا جو ہمیں ان کے اشعار میں بھی ملتی ہے۔ ماہ لقا پر جن ادیبوں نے قلم اٹھایا انھوں نے اس کے حسن اور حسن تمکنت کا عجب ہی انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس پر سب کو اتفاق ہے کہ خالق کائنات نے ماہ لقا چندا کو خیرہ کرنے والے حسن سے نوازا تھا۔ اور ظاہر ہے خود چندا کو بھی تا حیات اس پر ناز رہا یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

روبرو چندا کے ہوے کیا عجب
مشتری و زہری و پروین کو مات
گرمی وہ ہووے حسن میں چندا کے یا علی
جلوے کے اس کے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق

اسی طرح سے ماہ لقا کا دیوان جسے شفقت رضوی نے مرتب کیا ہے اس میں غلام حسین خان جوہر بیدری کی وہ مثنوی شامل ہے جو اس نے ماہ لقا کے سراپا کے بیان میں لکھی ہے۔ ذیل کے اشعار قابل تحسین ہیں۔

بہتر نمود ز عشق مجازی
باشد چو حقیقی از مجازی

من ہم پئی نام و یادگاری
از بہر بقائے فیض جاری

ماہ لقا کی غزلوں میں ان کی زندگی کی جھلکیاں بہت نمایاں ہیں اور ان کے حالات کی بھرپور عکاسی ہے۔ جس وقت اور زندگی کے جس دور میں وہ جن حالات اور کیفیات سے گزریں اس کو پیش کر دیا۔ کبھی وہ فطری طور پر صرف ایک عورت کے روپ میں نظر آتی ہیں، محبت، وفا اور خلوص کی متمنی۔ ایک وفا شعار اور وفا پرست عورت۔ ہرجائی پن سے بہت دور۔ اس طرح کے جذبات، خیالات اور پاکیزہ احساسات ان کے اشعار سے عیاں ہیں۔ بطور نمونہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

کی کوہ کن نے کوہ کنی میں نے جان کنی
جانباز تو نے اور بھی مجھ سا سنا کہیں

ہرچند راہ عشق میں دل پائمال ہے
روز جزا میں رتبہ ہے اس انکسار کا

ان تمام باتوں کے باوجود ہم اس بات کو نہ تو فراموش کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس پر پردہ ڈالنا کسی طرح مناسب ہے کہ ماہ لقا چندا کوئی خاندانی پیشہ ور نہیں تھیں اور نہ ہی اس دنیا میں جہاں سے ان کو تعلق ہو گیا تھا اپنی خوشی سے گئی تھیں۔ اب تک کی تحقیق نے اور راحت عزمی نے اپنے تحقیقی مقالے میں بہت تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ گردش ایام کا اس خاندان کی خواتین کس طرح شکار ہوئیں اور یہ کہ ماہ لقا کوئی طوائف نہیں بلکہ ایک پاکیزہ نفس علم وفن کی ماہر تھیں۔ البتہ اتنا سچ ضرور ہے کہ وقت اور حالات نے ماہ لقا چندا کو جہاں پہنچا دیا تھا اور جہاں وہ اپنی زندگی گزر بسر کرتی رہی تھیں اس کا اثر کسی نہ کسی حد تک کم یا زیادہ قبول کرنا امر فطری ہے اور خود اس کو اپنے کلام میں پیش کرنا دیانت داری اور بڑے فنکار ہونے کی دلیل بھی ہے۔ ماہ لقا کے مختصر سے دیوان میں جہاں پاکیزہ مضامین اور اعلیٰ افکار پر مبنی اشعار بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں وہیں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں شوخی و بے باکی متجاوز ہو کر عریانیت کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے اور بلاشبہ یہ اس ماحول کا نتیجہ تھا جس میں وہ اپنی زندگی کے شب و روز گزار رہی تھیں۔ نمونہ کلام۔

سوتا ہے ساتھ اپنے وہ گل عذار ہر شب
صد شکر دیکھتے ہیں کیا کیا بہار ہر شب

جا بجا ہوتے ہیں اس بات کے دن کو چرچے
تم جو چھپ چھپ کے کہیں جاتے ہو رات کے وقت

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے
جی میں ہے کیجیے پیار سے بوس و کنار خوب

ماہ لقا کی شاعری میں میں ذاتی حالات اور جذبات کی سچی نمائندگی ملتی ہے۔ ایک عورت اور اس کے فطری جذبے کی عکاسی کے لیے یہ شعر ملاحظہ ہو جو اس بازار میں رہنے کے باوجود دل کے نہاں گوشے سے نکل کر نوک قلم تک پہنچا اور ہمیشہ کے لیے ماہ لقا کی اصل فطرت کا غماز بن گیا۔

ہم سے کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا
حاضر ہیں ہم بھی گر ہو ارادہ نباہ کا

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ ماہ لقا چندا کی ذاتی زندگی کو غلط جان کر ان کے کلام کو انظر انداز کرنا ادبی دیانت کے خلاف ہے۔ فن کو فنکار کی ذاتی زندگی سے الگ کر کے فن کی کسوٹی پر پرکھنا اور پھر اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہی ادبی امانت کا تقاضا ہے۔ جس سے غالباً کوتاہی کا ہی نتیجہ ہے کہ محمد شمس الحق نے ماہ لقا کی وفات کے تقریباً دو سو سال کے بعد ''پیمانہ غزل'' 2008 میں مرتب کیا اور اس میں لکھتے ہیں کہ:

''ماہ لقا نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ یہ ہمیشہ سیکڑوں سپاہیوں کی باڈی گارڈ کے آگے اسلحہ لگائے، گھوڑے پر سوار سیر و تفریح کو نکلا کرتی تھی۔ اردو کی یہ پہلی دیوان شاعرہ ہے۔''

(پیمانہ غزل، (جلد اول) محمد شمس الحق، پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، 2008، ص 117)

جبکہ دہائیوں پہلے بہت سی مستند کتب سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ ماہ لقا اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ نہیں ہے۔

بلاشبہ ماہ لقا کے مختصر دیوان میں بہت کچھ ہے جو ان کو اردو شاعری میں ایک اہم مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔ ولی اور سراج کے بعد ماہ لقا اردو غزل میں ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ماہ لقا کی غزلوں میں ہمیں زبان کی صفائی زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ فصیح الدین رنج ''بہارستان ناز'' میں، بجا طور پر لکھتے ہیں کہ:

''ایسی شاعرہ اس وقت میں دیدنی تھی نہ شنیدنی تھی''

(بہارستان ناز، فصیح الدین رنج، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1965)

□□□

Dr. Salma Rafiq
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
E-mail:salma.rafiq.nhsdelhi@gmail.com

ڈاکٹر منیرہ زمانی

اردو ادب اور بھگتی تحریک

''بھگتی تحریک'' برہمن ازم کے زیر اثر معاشرہ کے رسوم رواج اور ذات پات پر مبنی امتیازات کے خلاف ردعمل کا نتیجہ ہے۔ بھگتی تحریک کا آغاز دراصل ساتویں صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان سے ہوا۔ جنوبی ہند کے سماجی مصلح کار رامانج کا شمار اس تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ''شری بھاشیہ'' رام نج کی مشہور تصنیف ہے جو شنکر اچاریہ کی کتاب کے بعد ویدانت کی یہ بہترین تشریح سمجھی جاتی ہے۔ رامانج نے اپنی کتاب میں ''برہما'' کو دنیا کا خالق حقیقی اور قادر مطلق بتاتے ہوئے بتایا کہ برہما کا قرب حاصل کرنے کے لیے صرف عبادت ہی کافی نہیں بلکہ محبت، پیار اور بھگتی اصل چیز ہے۔ بعد میں ان کا یہ موقف ''بھگتی تحریک'' کے طور پر متعارف ہوا رامانج کی اس تحریک کو رامانند اور دیگر شخصیات دیو اچاریہ، ہری نند، راگھونند، رامانند، بھگت کبیر، تلسی داس اور میرا بائی نے اپنے اپنے مقامی زبانوں میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے پروفیسر امت دیو نے اپنے مقالہAspects of Bhakti movement in India میں لکھا ہے کہ

''اس نظریے کی ابتدا قدیم ہندوستان کی برہمنی اور بدھ مت دونوں روایات اور گیتا جیسے مختلف صحیفوں سے ہوئی ہے۔ لیکن 7 ویں اور 10 ویں صدی کے درمیان جنوبی ہندوستان میں یہ تحریک پھلی پھولی۔ شروعاتی دور میں بھگتی تحریک خالص مذہبی تحریک تھی مگر بعد میں یہ سماجی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ مساوات اور وسیع البنیاد پر سماجی شراکت کی پرزور وکالت کرنے والی مقبول تحریک میں یہ تبدیل ہوگئی۔ اس تحریک کی سرپرستی اور اس کے فروغ دینے میں مختلف زبانوں کے شاعروں نے اہم کردار ادا کیا۔ دسویں صدی کو اس تحریک کا نقطۂ عروج مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ تحریک زوال کا شکا رہوگئ۔ تاہم بعد کی کئی صدیوں تک اس تحریک کے اثرات مختلف شکل اور زاویئے میں باقی رہا ہے۔ سلطنت دہلی کے قیام کے ساتھ ہی ملک کے مختلف حصوں میں بھگتی تحریک کے تصورات پر مبنی بہت سی سماجی۔مذہبی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان تحریکوں کو جنوبی ہندوستان کی پرانی بھگتی تحریک کے احیائے کے طور پر پیش کیا گیا۔ مگر ان میں سے ہر ایک تحریک اپنے تاریخی تناظر اور خصوصیات کی وجہ سے اپنی الگ پہچان قائم کرنے میں کامیاب رہی''۔

امت دیو کے مطابق دسویں صدی آتے آتے بھگتی تحریک زوال

کاشکار ہونے لگی تو اس وقت رامانوج اوران کے ساتھیوں نے بھگتی تحریک کو فلسفیانہ شکل دے کر اس تحریک کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس پر ہو رہے اعتراضات کا بھی دفاع کیا۔ رامانوج نے آرتھوڈکس برہمن اور بھگتی تحریک کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ رامانوج نے ویدوں تک نچلی ذاتوں کے لوگوں کی رسائی کو یقینی بنانے کے بجائے بھگتی تحریک کو عبادت کے طور پر پیش کرتے ہوئے بتایا کہ بھگتی کے ذریعہ ہر ایک شخص چاہے اس کا تعلق سماج کے کسی بھی طبقے سے ہو وہ خدا تک پہنچ سکتا ہے اور ان کی قربت حاصل کرسکتا ہے۔ (مقالہ امت دیو)

1017 میں پیدا ہونے والی رامانج کا تعلق جنوبی ہند کے ایک برہمن خانوادے سے تھا۔ ان کی تعلیمات کے بنیادی مقاصد وشنو اور لکشمی دیوی کے لیے مکمل سپردگی کی طرف لوگوں کو راغب کرنا تھا۔ رامانج کی تعلیمات کی تشہیر میں رامانند اور کبیر اور تلسی داس نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ رامانند نے رامانج کے برعکس عوامی زبان میں اپنے تصورات پیش کیے۔ یہ وہی دور ہے جب ہندوستان اسلام اور مسلمانوں سے متعارف ہو رہا تھا۔ بڑی تعداد میں دیار عرب کے مسلم دانشور اور صوفیا کرام ہندوستان میں فروکش ہو رہے تھے۔ اسلامی تعلیمات اور صوفیائے کرام کی دعوت و تبلیغ برہمن سے متاثرہ سماج جو ذلت و نکبت کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا کہ لیے رحمت مترقبہ ثابت ہوئی۔ ہندوستانی معاشرہ مکمل طور پر ذات پات کی تفریق کا شکار تھا۔ طبقاتی تفریق اور سماجی بالادستی اس قدر تھی کہ کسی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ برہمنوں کی خدمت دلت اور آدی واسی افراد کے لیے فرض کا درجہ رکھتی تھی۔ زمینوں پر چند اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے افراد قابض تھے۔ اس نظام سے ہندوؤں کے پسماندہ طبقات میں بڑے پیمانے پر بیزاری تھی۔ اسی دور میں جب صوفیائے کرام کی ہندوستان میں آمد ہوئی اور انھوں نے اپنے دروازے تمام طبقات کے لیے کھول دیے اس سے متاثر ہو کر بڑے پیمانے پر پسماندہ طبقات میں اسلام قبول کرنے کے رجحان میں اضافہ ہوا۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور مساویانہ نظام اور فراخدلانہ رویے کی وجہ ذات پات اور سماجی تفریق اور معاشی بدحالی کے شکار طبقات میں اسلام قبول کرنے کے رجحان نے آرتھوڈکس برہمن طبقے کو پریشان کردیا ۔انھیں یہ فکر ستانے لگی کہ اگر ہندوؤں بالخصوص پسماندہ اور نچلے طبقے کو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہونے سے نہیں روکا گیا تو جلد ہی ہندوؤں میں بھی مساوات اور انصاف کی آوازیں بلند ہونے لگے گیں اور ان کی سماجی بالادستی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یا پھر ہندو اقلیت میں آجائیں گے۔ چنانچہ رامانند جیسے بھگتی تحریک کے پیروکاروں نے اس تحریک کو اسلام کے مدمقابل پیش کرنے کی کوشش کی اور بھگتی کو بھگوان کی قربت کا ذریعہ بتاتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ گرچہ وید اور مندروں تک ان کی رسائی نہیں ہو رہی ہے مگر بھگتی کے ذریعہ بھگوان کی قربت حاصل کی جاسکتی ہے۔

بھگتی تحریک کے تاریخی عوامل کی بحث میں الجھے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بھگتی تحریک نے ادب و ثقافت کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ ہندی کے ساتھ اردو بھی اس تحریک سے متاثر ہوئی بلکہ اس تحریک کو ہندی اور اردو کے شعرا و ادبا نے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ''بھگتی تحریک نے شاعری کے ذریعہ برصغیر کی مذہبی اور فکری تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ محبت، یگانگت اور مساوات پر مبنی شاعری کے ذریعہ بھگتی تحریک کو عروج کی بلندی تک پہنچانے والے شاعروں میں دادو چتنیر، میرابائی، بھگت سورداس، نام دیو، پریم نند، تلسی داس، بھگت کبیر، سنت تکارام، ودیاپتی اور بہت سے دوسرے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے بھگتی تحریک اور اس کے اثرات سے متعلق لکھا ہے۔

''بھگتی تحریک نے فرد کو سکون، اعتدال اور توازن کی فضا میں روحانی رفعت حاصل کرنے کا سبق دیا۔ اس تحریک کا اساسی مقصد اخلاقی اور اصلاحی تھا۔ بھگتی تحریک نے خدا کے شخصی تصور میں اپنائیت پیدا کی اور کبھی آقا اور غلام، کبھی خاوند اور بیوی اور کبھی عاشق اور معشوق کا تعلق ابھارا۔ اس سے خدا کے تجریدی تصور کو شدید زک پہنچی لیکن تخلیقی اعتبار سے اس تصور نے جذباتی زاویے کو عمدہ کروٹ دی۔ ودیاپتی، میرابائی اور چندی داس کی شاعری میں اس تصور کی طرف نازک، لطیف اور گدرائے ہوئے اشارے ملتے ہیں۔

بھگتی تحریک سے متاثر اردو شعرا کا ذکر کرنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ صوفیائے کرام چوں کہ صلح کل، پیار و محبت اور اتحاد و یگانگی میں یقین رکھتے تھے اس لیے تصوفانہ فکر سے متاثر شعرا کی شاعری کو بھی بھگتی تحریک کے زمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ جب کہ بھگتی اور صوفی تحریک کے درمیان کئی بنیادی فرق ہیں۔ ان میں سب سے بنیادی فرق عقیدہ توحید ہے۔ صوفیائے کرام وحدانیت کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی بھی صوفی نہیں ہوسکتا ہے۔ جب کہ بھگتی تحریک میں عقیدہ توحید کوئی معنی نہیں رکھتا ہے بلکہ بھگتی تحریک کی ابتدا ہندوؤں کے بھگوان وشنو کی بھگتی سے ہوئی ہے۔ تاہم بھگتی تحریک اور تصوفانہ فکر کے درمیان کئی چیزیں مشترکہ ہیں جس میں خدا کی قربت کوئی بھی حاصل کرسکتا ہے۔ مخلوق خدا سے محبت، معاشرہ میں اعلیٰ و ادنی کے درمیان

مساوات کا قیام، اخوات و بھائی چارہ کا فروغ اور عدل و انصاف کا قیام بھگتی تحریک وصوفی تحریک کے بنیادی مقاصد ہیں۔کبیر سے لے کر خسرو کی شاعری میں یہی چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ بلکہ بعض مفکرین نے علامہ اقبال کی نظم 'نیا شوالہ' سے متعلق لکھا ہے کہ یہ نظم بھگتی تحریک سے متاثر ہے۔ اگرچہ بعد میں اقبال کی شاعرانہ فکر میں نمایاں تبدیلی آ گئی ہے اور وہ ''مسلم ہیں ہم سارا جہاں ہمارا'' کے قائل ہو کر اسلام کے آفاقیت کے نظریہ کو پیش کرنے لگے۔

کبیر سریر سرائے ہے کیا سوئے سکھ چین
سوانس نگارہ کوچ کا باجت ہے دن رین
ماٹی کہے کمہار کوں تو کیا روندے موہے
اک دن ایسا ہوویگا میں روندوں گی توہے

کبیر

صوفی تحریک اور بھگتی تحریک نے ادب کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ جمیل جالبی نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بقول رامانند، کبیر، تلسی داس اور سورداس کے بعد سب سے زیادہ امیر خسرو کی شاعری میں بھگتی تحریک کے اثرات دیکھے جاتے ہیں۔ حضرت امیر خسرو اپنے عہد کے اعلیٰ پایہ کے سخن گو، موسیقار، موجد، فلسفی، ماہر لسانیات اور عظیم درجہ کے صوفی تھے۔ حضرت امیر خسرو نے گرچہ اپنی شاعری کا بیشتر حصہ فارسی میں قلم بند کیا ہے، لیکن ان کی اُردو یا ہندوی شاعری اس لحاظ سے ایک بے مثال ہے کہ اس میں ہندوستانی تہذیب وثقافت اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو نہایت فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمان نے لکھا ہے کہ امیر خسرو نے اپنی شاعری میں ہندوستان کی ہر شے سے محبت، عظمت ہندوستان کا اعتراف، ہندوستان کے خوبصورت جغرافیائی مناظر کشی، مہکتے ہوئے گل وگلزار، تناور درخت اور رواں دواں ندیاں اور دریاؤں کو جس خوبصورت انداز میں پیش کیا وہ بے مثال ہے۔ ان کے بقول

ان کو چین کا حسن بھی نہیں بجا کیونکہ ان کے معیار کے مطابق اس میں عجز وانکسار نہیں۔ تاتاری حسینوں کے لبوں پر ہنسی نہیں دکھائی دیتی اور ختن کے حسینوں کے چہرے پر نمک نہیں ہوتا۔ سمرقند اور قندھار کے حسن میں مٹھاس یعنی قند کی کمی ہے۔ اسی طرح مصر اور روم کے سیمیں بدن حسینوں میں وہ چستی اور چالاکی نہیں پاتے۔ خسرو کو ہندوستان کے حسن میں یہ ساری خوبیاں دکھائی دیتی ہیں یعنی عجز وانکسار بھی، لبوں پر تبسم بھی، چہرے پر نمک بھی، شیرینی بھی، اداؤں میں چستی اور چالاکی بھی۔ اسی لیے بے اختیار ہو کر کہتے ہیں:

بتانِ ہند را نسبت ہمیں است
بہر یک موئے شاں صد ملکِ چین است

گوپی چند نارنگ نے امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت کو اس انداز سے خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ:

''امیر خسرو ہندوستان کے عاشق صادق اور سچے وطن پرست تھے۔ اپنی شاعری میں جہاں جہاں امیر خسرو ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں ان کی روح وجد میں آجاتی ہے اور جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں''۔

ہندوستان کے موسموں، تیوہاروں اور رسومات پر حضرت امیر خسرو نے لاتعداد اشعار کہے ہیں بلکہ انھوں نے ہندوستان کی مقبول اصناف دوہا، گیت، دوسخنے، کہہ مکرنی اور گیت جیسے اصناف پر نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ انھوں نے معیاری اشعار کہے۔

''امیر خسرو نے اردو غزل کو گیت کا رس اور نغمگی عطا کی اور گیت کی صنف کو دوہے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔ دوہا غزل کے مفرد شعر کی طرح زندگی کی کسی عمومی حقیقت کو ایجاز و اختصار سے پیش کرتا ہے۔ اس کے آخر میں فارسی غزل کی طرح قافیے کا التزام بھی ہوتا ہے اور پورا مضمون دو مصرعوں میں سما جاتا ہے۔ امیر خسرو نے غزل کی ہیئت کو دوہے کی زمین قرار دیا اور اس میں ہندی تہذیب اور مزاج کے بیج بو دیئے''۔

معروف ناقد اور اردو کے پروفیسر ڈاکٹر مولا بخش نے لکھا ہے کہ'' کبیر امیر خسرو کی شاعری اور ان کے نظریات سے بہت متاثر تھے، جیسا کہ انھوں نے اپنے دوہوں میں، اپنے بہت سارے نظریات کو نقل کیا۔ اصل میں، کبیر کے کچھ دوہے، خسرو کی شاعری کے تقریباً ترجمے ہیں''۔

امیر خسرو کے لیے شاعری صرف تفریح طبع کے لیے نہیں تھی بلکہ ان کی شاعری میں پاک باز اور خدا رسیدہ انسان کا دل دھڑکتا تھا، غم گساری اور اشک سوئی کی پرزور وکالت تھی۔ انسان دوستی ان کا نصب العین تھا۔ وہ دوسروں کا دکھ درد دیکھ کر تڑپ جاتے تھے۔ خسرو اپنی شاعری کے جلو میں ہندستان میں قومی یک جہتی اور وطن دوستی کا راگ چھیڑتے تھے۔ وہ گرچہ ترک النسل تھے، مگر انھیں اپنی مادر ہند پر بے پناہ فخر تھا۔ ہندی کے ایک مشہور عالم ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری ان کی حب الوطنی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''انھیں اپنے مادر وطن پر فخر تھا۔ ان کی تصانیف میں

ہندوستانی تہذیب وفلسفہ، مہمان نوازی، گلوں، رسم ودستور، یہاں کے حسن اور فیاضی وکشادہ دستی کی مدح وستائش کی گئی ہے۔"

وہ اپنی اسلام پسندی کے باوصف انسانیت پسندی کے وصف سے مزین تھے۔ انھیں اونچ نیچ، نفرت، تعصب اور تنگ نظری سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان کا یہ دوہا ان کی اسی انسان دوستی سے عبارت فکر کا غماز ہے:

خسرو دریا پریم کا، الٹی وا کی دھار
جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا سو پار

امیر خسرو دوستی اور ایک دوسرے کے ساتھ تعلق میں فنائیت اور جذب وانجذاب کے قائل تھے۔ وہ من وتو کی تفریق کو مٹانے کے قائل تھے کہ اسی مدھرملن سے انسانیت، محبت اور دوستی کی ایک نئی صبح کا آغاز ہوسکتا ہے اور دنیا انسانوں کے لیے امن وآشتی اور امن وسلامتی کا گہوارہ ثابت ہوسکتی ہے۔ انھوں نے اسلام، اسلامی تعلیمات، اور اسلامی تہذیب سے اپنی وابستگی بھی برقرار رکھی، مگر انھوں نے ہندوی سنسکرتی، ہندستانی علوم وفنون اور یہاں کے راگ راگنیوں کی بھی شعری تخلیقی پیرایے میں تعریف کی۔ جو علوم وفنون خالص ہندؤوں سے منسوب تھے، اس کا بھی برملا اظہار کیا، ہندؤوں کی بہادری، دوسری قوموں پر ان کی برتری، سنسکرت زبان کی بالادستی، ہندستانی جانور، ہندستانی اشیا اور ہندو مرد وعورت کی دوسری خوبیوں کو اپنی نظم کا محور بنایا۔ طویل غزل کے یہ فارسی اشعار اسی معنی سے پردہ اٹھاتے ہیں، جو آج ہر اردو داں شخص کے ہونٹوں پر موجود رہتا ہے:

من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

علامہ سید سلیمان ندوی نے دسمبر 1944 میں مدراس میں منعقد آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں امیر خسرو کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"امیر خسرو نے ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا، وہ گو نسلاً ترک تھے، مگر ان کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا۔ انھوں نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور سب سے پہلے اس ملی جلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی، اور موسیقی کی ایک نئی لے ہندی اور ایرانی سے پیدا کی، اپنی فارسی مثنوی نہ سپہر میں ایک مستقل باب ہندوستان کی خوبیوں پر لکھا ہے اور یہاں کے ملکی باشندوں کے علم، آرٹ اور ہنر کی تعریف میں اپنی شاعری کا پورا جوہر دکھایا ہے۔"

(دیباچہ، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، سید صباح الدین عبدالرحمن، معارف پریس اعظم گڑھ، 1996)

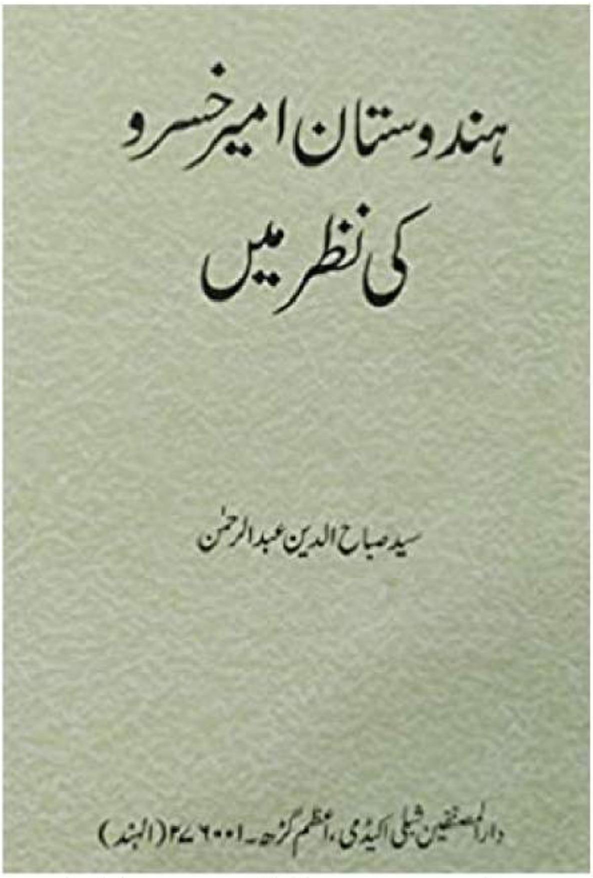

امیر خسرو نے اپنی شاعری کے مختلف اصناف میں فنافی اللہ، پیار و محبت اور بھائی چارے کو عنوان بنا کر انسان دوستی کی تبلیغ کی۔ ان کی اس پاکباز دیرینہ روایات کے اثرات اردو کے مختلف شعرا کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ خواجہ میر درد کو اردو کا سب سے بڑا صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے منفرد انداز کی وجہ سے صوفی شاعروں میں الگ مقام رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں درجنوں ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں وہ فنافی اللہ کی سراپا تصویر نظر آتے ہیں۔ بطور مثال

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے کہ جہاں تو سما سکے

1905 سے لے کر 1908 تک علامہ اقبال حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی بلند آہنگی کے ساتھ اس کے پیرو کار نظر آتے ہیں۔ ان کی مشہور نظمیں "ہمالہ، پرندے کی فریاد، صدائے درد، تصویر درد، ترانہ ہندی اور

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' اس دور کی تخلیق ہے۔ بلکہ علامہ اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' میں یک قومی نظریہ نمایاں ہو کر نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال کے اسی تصور کو بعد میں مہاتما گاندھی، مولانا آزاد اور پنڈت نہرو نے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ پنڈت جی کے مطابق:

''ہندوستانی قوم کسی ایک طبقہ، ایک مذہبی گروہ، ایک نسل یا ایک لسانی جماعت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی دھارا ہے جس میں جگہ جگہ سے مختلف دھارے آکر شامل ہوجاتے ہیں اور اسی طرح یہ مختلف دھارے، ہم آہنگ اور ایک ذات ہوکر ایک عظیم دھارے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ ہندوستانی قومیت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس سرزمین پر بسنے والی جماعتوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ازل سے اس کا باشندہ رہا ہو۔ مختلف تاریخی اور سماجی محرکات کے زیر اثر مختلف قومیں مختلف زمانوں میں ہندوستان آئیں اور یہیں کی ہو رہیں اور سرزمین ہند نے انہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ اسی لیے پنڈت نہرو اس بات پر مصر تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے برہمن، مسلمان خواہ ترک ہوں یا ایرانی، افغانستان کے باشندے ہوں یا قدیم دراوڑی یا اچھوت نسل سے تعلق رکھتے ہوں یا سامی نسل سے، سیتھین (Sithian) ہوں یا آریائی یہ سب ایک گلدستے کے اجزا ہیں اور اب تو یہ ایک دوسرے میں اس درجہ جذب ہوچکے ہیں کہ بالکلیہ طور پر ایک قوم کے افراد ہوچکے ہیں''۔ (ادبی۔فکری تحریکات اور اقبال)

علامہ اقبال نے اپنے مذکورہ نظموں میں ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی عظمت کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور ''نیا شوالہ'' میں اقبال کا فکر وفن پوری قوت اور آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انھوں نے نہایت ہی برجستہ اور بے تکلفانہ انداز میں ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کی ہے۔ اقبال نے اپنے اس نظم کے ذریعہ طبقہ واری اختلافات کو از کاررفتہ اور فرسودہ بتاتے ہوئے ہندوستانی عوام کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

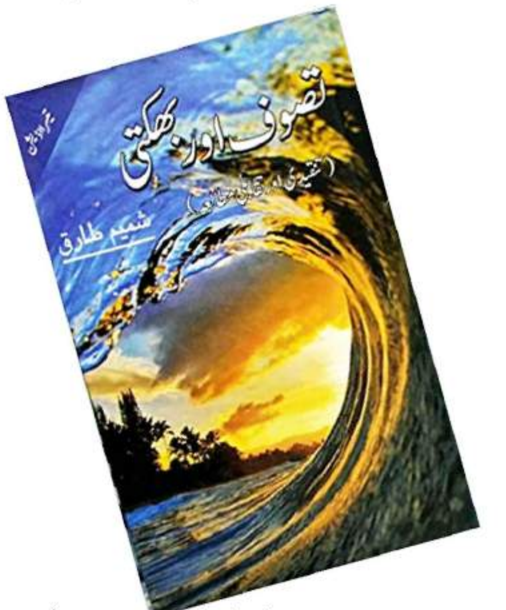

آپسی اختلافات اور تنگ نظری کو انھوں نے سامراج کی ذہنی اپج قرار دیتے ہوئے اس کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی اس نظم کو عزیز احمد سمیت دیگر کئی نقادوں نے کبیر اور بھگتی تحریک سے متاثر قرار دیا ہے مگر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اقبال نے فکری اعتبار سے کبھی بھگتی تحریک کے اتحاد مذاہب کی وکالت نہ شروعاتی دور میں کی ہے اور نہ بعد کے دور میں ۔اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ علامہ اقبال کی نظموں میں بھی بھگتی تحریک کے فکری اور تہذیبی پس منظر کا عکس نظر آتا ہے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

حوالے:

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی،
تصوف اور بھکتی: تنقیدی اور تقابلی مطالعہ
ادبی۔فکری تحریکات اور اقبال

□□□

Dr Monira Zamani
Mohalla Purani Qila
Ismayeel Shaheed Road
District Siwan-841226 (Bihar)
Mob: 9661231375

تہنیت فاطمہ

فاروقی کے خطوط جائسی کے نام

شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے علمبردار اوراس کے روح رواں تھے۔ان کے تعلقات برصغیر ہندو پاک کے ہر درجہ کے لکھنے والوں سے تھے۔انھوں نے رسالہ ''شب خون'' کو1966 میں شروع کیا۔اس رسالہ کی ترتیب و تزئین اور اس کی ادارت کے فرائض انھوں نے سرانجام دیے۔اس سلسلے میں انھوں نے مختلف ادبی شخصیات کوخطوط لکھے۔محمد حسن عسکری نے ان کے کئی خطوط کے مفصل جواب لکھے لیکن فاروقی کے خطوط کو یکجا کیا ہوا ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔شمس الرحمٰن فاروقی خط وکتابت میں تساہل سے کام نہیں لیتے تھے۔خطوط کا بروقت جواب دینا اور تشفی بخش ادبی مکالمہ ان کا وطیرۂ خاص رہا ہے۔وہ اندرون ملک کے احباب کوخطوط کے لیے in land latter کا استعمال زیادہ کیا کرتے تھے اور مختصر خط کے لیے پوسٹ کارڈ۔ملک کے مختلف حصوں سے اہل قلم حضرات ان سے ادب کے حوالے سے مختلف النوع مسائل پر صلاح ومشورہ کیا کرتے تھے،جن کے جواب وہ بروقت دیا کرتے تھے۔جن لوگوں کوخطوط لکھے اب تک کسی نے انھیں یکجا کر کے شائع نہیں کیا ہے۔البتہ کبیر احمد جائسی سے فاروقی کی جو خط وکتابت رہی اسے 'شمس کبیر' کے نام سے کبیر احمد جائسی نے یکجا کر کے شائع کیا ہے۔کبیر احمد جائسی نے کچھ عرصہ اعظم گڑھ میں بھی گزارا تھا۔اس

وجہ سے فاروقی سے ان کی وطنی محبت تھی۔ جائسی سے ان کی مراسلت بڑی لمبی رہی جس کا دورانیہ 23 اپریل 1958 سے شروع ہو کر 12 ستمبر 2003 تک کا ہے جب کہ انھوں نے پیش لفظ میں یہ لکھا ہے کہ زیر نظر کتاب مجموعہ ہے ان خطوط کا جو شمس الرحمٰن فاروقی نے مجھ کو اپریل 1958 سے مارچ

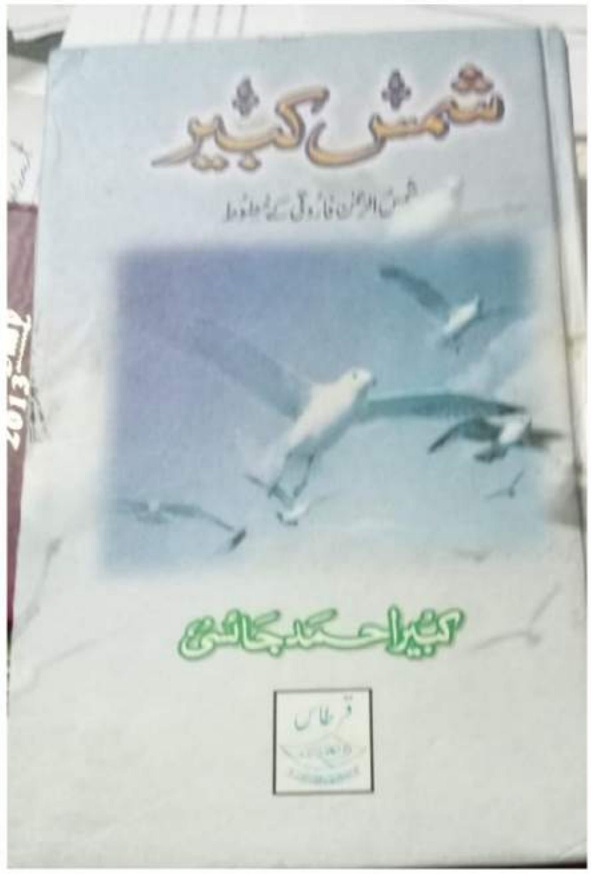

2000 تک کے عرصے میں لکھے ہیں۔ حالانکہ 133 خطوط کے اس مجموعے میں آخری خط پر 12 ستمبر 2003 درج ہے۔ ان خطوط کی اشاعت کا مقصد انھوں نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

> اگر یہ خطوط ذاتی نوعیت کے مسائل کے ذکر تک محدود ہوتے تو ان کی اشاعت کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ان میں جو بہت سے ادبی مسائل زیر بحث آئے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کو منظر عام پر لایا جائے۔ مزید برآں ان خطوط میں دونوں معاصرین کے وہ بہت سارے اشعار بھی محفوظ ہیں جو نہ تو فاروقی صاحب کے مجموعۂ کلام ''آسمان محراب'' میں ملیں گے اور نہ میرے مجموعہ کلام ''صحرا صحرا'' میں۔ اس لیے ان کی اشاعت اور بھی ضروری سمجھی گئی کہ ان کے ذریعہ یہ حقیقت بے نقاب ہوسکے گی کہ اب سے چار دہائیاں قبل دونوں کس طرح کے شعر کہہ رہے تھے اور ان پر کس انداز سے ایک دوسرے سے اظہار خیال کیا کرتے تھے۔

(شمس کبیر (شمس الرحمٰن فاروقی کے خطوط)، مرتبہ، کبیر احمد جائسی؛ قرطاس پبلی کیشنز، پاکستان؛ فروری 2004ء، ص:8)

کبیر احمد جائسی کا یہ کہنا درست ہے کہ فاروقی کے بہت سارے اشعار جوان خطوط میں محفوظ ہیں ان کی کلیات تک میں شامل نہیں ہیں۔ ان خطوط میں فاروقی نے اپنی ملازمت سے لے کر ادبی سرگرمیوں تک کا ذکر بڑے بے باکانہ انداز میں کیا ہے۔ اگر ان خطوط کے کوائف جمع کر دیے جائیں تو فاروقی کی ذاتی و ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ کئی ایسی باتیں سامنے آنے کے امکانات ہیں جو لوگوں کے لیے نئی ہوسکتی ہیں۔ ان خطوط سے یہ بھی پتہ چلا کہ فاروقی کو ملازمت 1958 میں ملی تھی۔ انھوں نے خطوط میں ملازمت کے شروع کے زمانے کی مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے۔ انھوں نے شبلی کالج اعظم گڑھ میں لکچرر کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی شروع کی تھی۔ ابتدائی دنوں سے ہی شاعری کی طرف راغب رہے۔ اسی لیے ان کے یہاں سخن فہمی اور سخن سنجی زیادہ ملتی ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فاروقی فراق گورکھپوری کو اچھے شاعروں میں شمار نہیں کرتے تھے لیکن ان کی زمینوں پر بھی طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ جس کی مثالیں اشعار کی صورت میں ان خطوط میں موجود ہیں۔ اسی طرح مضطر خیرآبادی بھی ان کی نظر میں کوئی اہم شاعر نہ تھے لیکن 1958 میں مضطر خیرآبادی کے دو شعر نقل کرتے ہوئے ان کے تیور کی بڑی تعریف کی ہے۔

6 دسمبر 1958 کے خط میں انھوں نے کبیر احمد جائسی کو جواب میں یہ لکھا تھا کہ استعارہ اور تشبیہ پر اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ آگے انھوں نے انگریزی نقادوں کی سات آٹھ کتابوں کے نام گنوائے تھے اور جائسی سے ان کتابوں سے استفادہ کرنے کو کہا تھا۔ کتابوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاروقی کو انگریزی زبان و ادب سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ 18 دسمبر 1958 کے ایک خط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انگریزی زبان میں وہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے جائسی کی کتاب ''نقوش فانی'' پر تبصرہ لکھ کر Illustrated Weekly میں اشاعت کی غرض سے بھیجا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوسکا تھا۔ اسی سال 26 دسمبر کے ایک خط سے انکشاف ہوتا ہے کہ ان کی غزل کو بھی ناقابل اشاعت قرار دے کر واپس کر دیا گیا۔ درج ذیل اقتباس سے فاروقی صاحب کی ناخوشگواری

کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> میں نے ''آرزو کی بات'' والی غزل ''آج کل'' کو بھیجی تھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ''غزل کی گنجائش نہیں۔'' غالباً انکار کا یہ مہذب طریقہ ہے۔ بہر حال نہ معلوم کیوں بڑی کوفت سی ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ جس غزل کو میں اپنی بہترین غزل سمجھتا ہوں وہ ان کے لائق نہیں ہے تو شاید میں واقعی بہت گھٹیا شعر کہتا ہوں اور مجھ کو اپنی شاعری کو Judge کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بہر حال کچھ دیر کے بعد یہ Mood اتر گیا اور جھولے کے اتار کے بعد یہاں تک پہنچا کہ Keats کی شاعری کو بھی لوگوں نے ایسے ہی قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا اور ہر طرح اس کی بے حرمتی کی تھی۔ نہ جانے میں Keats بننے والا ہوں یا دنیا کے لاکھوں بے نور اور نامراد شعرا کی طرح میں بھی کچھ بکواس کر کے ختم ہو جاؤں گا۔ میں خود تو شاید اپنی Worth سمجھتا ہوں لیکن کوئی ضروری نہیں کہ جو میں سمجھتا ہوں وہ درست ہوں۔(ایضاً،ص:36)

اسی طرح کبیر احمد جائسی کے نام خط نمبر 18 میں اپنی ایک نظم ''یاد دہانی'' اشاعت کے لیے نیاز فتح پوری کو بھیجی تھا لیکن اسے ناقابل اشاعت قرار دیے جانے کے بعد کو اپنی شاعری سے مایوس ہوتے ہوئے لکھا ہے:

> نظم ''یاد دہانی'' نیاز صاحب کو بھیجی تھی ان کا جواب لکھتا ہوں ''محترمی! نظم میں بدعت تو ہے لیکن ''بدعت حسنہ'' نہیں ، مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ یکسر تکلف و آورد ہے'' سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی شاعری کے مستقبل سے مایوس ہو جاؤں کہ اردو شاعری کے مستقبل سے۔ اس مسئلہ کو تم ہی حل کرو۔ بہتر یہی تھا کہ میں اشاعت کے چکر میں نہ پڑتا۔(ایضاً،ص:38)

انگریزی میں بھی ان کے ساتھ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ انھوں نے مضامین بھیجے تو ان کو مسترد کر دیا گیا اور ان کو اس سلسلے میں درج ذیل جواب موصول ہوا:

> میں نے ادھر ایک طویل مضمون انگریزی میں غزل کی ماہیت پر لکھ کر ایک مقتدر انگریزی اخبار کو روانہ کیا تھا۔ وہ شائع کرنے کو تیار ہیں لیکن کہتے ہیں کہ زبان عام فہم اور اسلوب سادہ نہیں۔ مضمون کو مختصر کیجیے۔(ایضاً،ص:96-97)

اصل میں فاروقی غیر اردو داں حلقہ کو اردو شاعری کے نازک مسائل سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔ فاروقی کو انگریزی زبان پر دسترس ہونے کی وجہ سے وہ صرف ادبی موضوعات پر ہی کتابیں مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ علم کے دوسرے شعبہ جات سے بھی انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ نفسیات، جنسیات، سماجیات کے حوالے سے مغربی مصنفین بھی ان کے زیر مطالعہ رہے۔

> شمس الرحمٰن فاروقی اپنے دوران ملازمت ناگپور سے انھیں خط لکھا کرتے تھے اور ایک دوسرے کے احوال سے باخبر کرتے تھے لیکن وہ مدیران رسائل سے ناخوش تھے کیوں کہ 6اپریل 1959 کے ایک خط میں یہ شکایت کی ہے کہ ''ایک طویل نظم لکھ رہا ہوں جس کا موضوع فکر اور ہیئت سب اتنے انوکھے ہیں کہ جہاں بھی پڑھوں گا یا اشاعت کے لیے بھیجوں گا۔ غالباً نامنظور ہو جائے گی۔ چراغ تہہ داماں کی طرح رکھے ہوئے ہوں۔''(ایضاً،ص:51)

ساٹھ برس سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی شمس الرحمٰن فاروقی کو بحیثیت شاعر وہ ادبی مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنا رنگ شاعری اختیار کرنا چاہتے رہے ہوں، جس کا رشتہ مغربی شاعری سے قائم ہو یا پھر اردو شاعری کی روایتی طرز و اسلوب اختیار نہ کرنا بھی ایک سبب ہوسکتا ہے۔ ان کو انگریزی، اردو اور فارسی سے کماحقہ واقفیت تھی کیوں کہ درج ذیل جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ان زبانوں پر اچھی خاصی دسترس رہی ہوگی:

> تمہارے اشعار کا انگریزی ترجمہ شاید کامیاب نہ ہو۔ اردو اور فارسی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ ان زبانوں کا محاورہ اس قدر مقامی اور محدود ہے کہ کسی اور زبان میں جا کر بے معنی اور مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ ''دشکن'' کا ترجمہ ''Wrinkless'' اگر کروں تو ذوق لطیف سیاہ پوش ہو جاتا ہے۔(ایضاً،ص:51)

فاروقی کا ذہن ابتدا سے ہی تنقید کی طرف مائل تھا۔ اس میں انھوں نے اپنا کمال ہنر دکھایا۔ بعد کے زمانے میں انھیں اردو کے اہم نقاد کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا اور اردو تنقید میں ایک منفرد نام کی حیثیت سے برصغیر ہند و پاک میں معروف ہوئے۔ ایک خط میں خود انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ تنقید میں اگر کام کرنا ہو تو کوئی ایسا کام کرو جو اردو تنقید میں انوکھا ہو۔ شمس الرحمٰن فاروقی شروع سے ہی تنقیدی ذہن و فکر رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ساٹھ برس پہلے کی تحریروں اور خطوط میں بھی انھوں نے اپنی تنقیدی فکریات کو واضح کیا ہے۔ اس ضمن میں کبیر احمد جائسی کو

مناسب ہدایات دیا کرتے تھے۔ ان کا علمی اندازِ تحریر کم وبیش ہر جگہ نمایاں ہے۔ فاروقی کے مزاج میں کسی تخلیق کو تجزیاتی انداز سے مطالعہ کرنے کا ہنر بڑا واضح تھا۔ انھوں نے 2 فروری 1959 کے ایک خط میں جائسی کی غزلوں پر جو اظہار خیال کیا ہے وہ بڑی تفصیل کے ساتھ تشفی بخش اور قابل غور ہے۔ خط نمبر 22 میں بھی کبیر احمد کی غزلوں پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور اشعار کے نقائص ومحاسن کی طرف نشاندہی کی ہے۔ کبیر احمد جائسی خطوط کے ذریعے اپنے اشعار وغزل پیش کر کے اس میں اصلاح اور ان کی رائے کے طلبگار رہا کرتے تھے۔

فاروقی اپنے خطوط میں جائسی کو نصیحت آمیز باتیں لکھتے رہے ہیں۔ یہ لوگ گھریلو مسائل وامور اور ازدواجی زندگی سے متعلق باتیں بھی خطوط میں قلمبند کیا کرتے تھے۔ جائسی کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی خواہش پر فاروقی نے 7 اگست 1959 کے خط میں ازدواجی زندگی کے حوالے سے بڑی معنی خیز باتیں تحریر کی ہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباس قابل توجہ ہے:

> شادی کے بارے میں سقراط کا ایک لطیفہ بڑا چست اور قابل غور ہے۔ کہتا ہے ''شادی ضرور کرو اگر بیوی اچھی ملے گی تو زندگی خوش گزرے گی، اگر بری ملے گی تو فلسفی بن جاؤ گے اور فلسفی بننا ہر ایک کے لیے اچھا ہی ہوتا ہے۔'' میرے خیال میں حکیمِ یونان کا فیصلہ واقعی قول فیصل ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی شاید خوبصورت بیوی تمہارے مزاج کی افسردگی دور کرنے میں بڑی مدد دے گی۔ (ایضاً،ص:67)

شمس الرحمٰن فاروقی کے خطوط میں تنقیدی لب ولہجہ ان کے اپنے ذہنی مزاج کے مطابق ہر جگہ نمایاں ہے۔ انھوں نے کبیر کی غزلوں پر جابجا اعتراضات بھی کیے ہیں اور تحسین آمیز لب ولہجہ بھی اختیار کیا ہے۔ 22 دسمبر 1959 کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری میں عروضی علم کو بھی وہ ضروری سمجھتے تھے تاکہ شاعری کا معیارِ سخن قائم رہ سکے۔ انھوں نے ان کی غزل کی تقطیع بھی کی ہے لیکن آخر میں یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ:

> ''غیاث اللغات'' اور ''حدیقۃ البلاغۃ'' وغیرہ میں عروض پر اچھی بحث ہے۔ حالاں کہ بعض ماہر عروضیوں کے خیال میں یہ کتابیں بھی مبتدیانہ اور ناقابل اعتبار ہیں لیکن اگر تم خواجہ عبدالرؤف عشرت کی شاعری کی پہلی دوسری اور تیسری کتابیں ہی پڑھ ڈالو، تو بڑا کام ہو۔ عروض جاننے کی ضرورت ہم سب کو ہوتی ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ اس کے بغیر مصرع غیر موزوں ہو جاتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ عروض شاعری کی بنیاد ہے اور اس فن کی گہرائیاں لسانیات، علم موسیقی اور زبان کی صلاحیتوں اور حدود کا پتہ دیتی ہیں۔ (ایضاً،ص:95)

شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں اصول شاعری کی سخت پابندی کے قائل تھے اور زیادہ تر ادبا وشعرا سے کم وبیش اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ جائسی علمی وادبی گفتگو پر فاروقی کو اکساتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض خطوط ایک طویل مضمون کی شکل اختیار کر جاتے تھے مثلاً 11 مئی 1960 کا خط جس میں شاعری کی زبان و بیان، تشبیہ واستعارے اور محاورے پر اچھی خاصی گفتگو کی گئی ہے۔

مغربی شاعروں پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے ورڈس ورتھ، بائرن، ایٹس اور ایلیٹ کی شاعری پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ مختلف ادبیات کے حوالے سے جنس پر بھی گفتگو کی ہے ممکن ہے اسے ایک طبقہ پسند نہ کرے لیکن انھوں نے جنس کے موضوع پر بڑی کھل کر باتیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں تفصیل سے 20 دسمبر 1960 کے خط میں پڑھا جاسکتا ہے۔ فاروقی کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ کبیر احمد جائسی ان سے ادب اور تنقید کے مختلف مسائل وموضوعات پر سوال کرتے تھے مثلاً کبھی تنقید کے معیار پر سوال کرتے تھے تو کبھی مغربی ادب پر، ادبی تبصرے، ادب و شاعری غرض مختلف النوع سوالات کے جوابات ہی ان خطوط میں جابجا اپنی اجمالی اور تفصیلی شکل میں ملتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے محقق ونقاد کے ساتھ ساتھ بحیثیت مبصر اردو ادب میں اپنا ایک مقام محض اپنی بے باکی اور تصورات میں آزادانہ روی کے باعث بنالیا تھا۔ وہ کبھی اخفائے راز میں کبھی کوئی گفتگو یا تبصرہ نہیں کرتے تھے۔

کبیر احمد جائسی کے نام لکھے گئے یہ خطوط اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان خطوط سے ذہنی ارتقا، ادبی حدود وقیود، مطالعہ کا ذوق وشوق، مغربی ادب سے واقفیت نیز فاروقی کی علمی وادبی زندگی اور ان کے افکار و نظریات کو واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

□□□

Tahneet Fatima
Research Scholar
Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob: 8299586823

مشغولیات اور گھریلو ذمہ داریوں میں توازن

خواجہ کوثر حیات

خواتین بنیادی طور پر زندگی کے معاملات میں سنجیدہ واقع ہوئی ہیں ۔خصوصاً امورِ خانہ داری میں اس کی فرض شناسی ، پسند ناپسند کا خیال رکھنے کا رویہ، معاملہ فہمی ، نفسیات کو سمجھ کر قدم اٹھانا، حکمت عملی سے لے کر ایک خاندان کو تعمیر کرنا اور معاشرہ اور سماج کے بہترین شہری تیار کرنا یہ تمام امور وہ گھر میں انجام دیتی ہیں۔

اشرف المخلوقات میں عورت کی تخلیق ساری لازوال نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی خوبصورت نعمت جو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی شکل میں نوازی گئیں ۔ جسے رب کائنات نے جذبات و احساسات ، محبت و شفقت ،صبر و نرمی، غمگساری، ایثار و قربانی، نازک خیالی ، امورِ خانہ داری، نزاکت و نفاست وسلیقہ مندی جیسے اوصاف جو ہر سے مزین کر کے ساتھ اسے فطری تقاضے اور مختلف فکری رجحانات بھی ودیعت فرمایا ہے۔

کچھ دہائیوں قبل خواتین امورِ خانہ داری میں ہی اپنے آپ کو مصروف رکھتی تھیں۔ جیسے چکی پر گیہوں پیسنا، اپنے ہاتھوں سے دالیں تیار کرنا، سل پر مرچ اور مسالے پیس کر تیار کرنا۔ سیویاں ، پاپڑ و بڑیاں تیار کرنا غرض کھانے کے بیشمار لوازمات اپنے ہاتھوں تیار کرنا اس کے علاوہ کپڑوں کو دھونے کے ساتھ انھیں مختلف رنگ دے کر اسے خوبصورت بنانا، کپڑوں کی سلائی ، کپڑوں اور چادروں پر کڑھائی کے ذریعے بیل بوٹے تیار کرنا، اون کے ذریعہ گرم ملبوسات تیار کرنا۔

ان مصروفیات کا ذکر کرنا یہاں اس لیے ضروری ہے کہ ہم گزشتہ سے حال کا فرق اور آسانیوں کو محسوس کر سکے۔ یہی سارے کام خواتین کے عموماً مشغولات ہوا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کی تربیت پر بھی بھرپور توجہ دیتیں، کبھی اخلاقی کہانیاں سنا کر تو کبھی سبق آموز واقعات کے ذریعے ۔ آج سائنس کی ترقی نے نا صرف دنیا کو تیز رفتار کر دیا بلکہ خواتین کے بہت سارے کام آسان سے آسان تر ہو گئے ۔گھنٹوں میں ہونے والے کام مشینوں کے ذریعہ اب منٹوں میں ہو جاتے ہیں اور پھر فراغت ہی فراغت۔

ملازمت پیشہ خواتین ہو یا پھر گھریلو خواتین دن بھر کی سخت و مسلسل تگ و دو کے بعد بھی ان کے اندر کوئی خواہش دبی ہوتی ہے جو کبھی خود کی آرائش سے تشفی پاتی ہے تو کبھی گھر کی ترتیب و تزئین سے ۔آج خواتین فارغ وقت میں مختلف مشغلوں کو اختیار کر کے خود کو، گھر کو اور خاندان کو نا صرف سنوار رہی ہیں بلکہ مضبوط بھی بنا رہی ہیں۔

مطبخ توان کی سب سے بڑی ملکیت ہوتا ہے جہاں وہ نت نئے تجربات کر کے گھر کے لوگوں کی خوشی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ خواتین اپنی پسند اور صلاحیتوں کے لحاظ سے ذمہ داریوں کے ساتھ اپنے مشغلے کو بھی

بحسن وخوبی بروئے کار لاتی ہیں وہ گھر اور مشغلے میں توازن رکھنے میں کامیاب بھی ہوتی ہیں۔ گھر اور خاندان کے فرائض بحسن وخوبی ادا کرتے ہوئے مشغلے کو انجام دینا خود خواتین کے لیے اور خاندان کے لیے بھی فرحت وانبساط کا باعث بنتا ہے۔

اگر ذمہ داریاں بے دلی سے انجام دی جائیں تو وہ خواتین کو ناصرف تناؤ اور افسردگی کا شکار بناتی ہیں۔ بلکہ ان کے مزاج میں جارحیت بھی پیدا کر دیتی ہیں جو اس کے چڑچڑے پن کا باعث بنتا ہے اور یہ رویہ صرف خود ان کی صحت کے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوتا ہے بلکہ خاندان کے سکون واطمینان کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ ان کی ذراسی غفلت پورے کنبہ کے لیے نقصان دہ ثابت نا ہو اس لیے کہ گھر کی بنیاد انھیں پر ہوتی ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ خاندان کی ترتیب و تربیت میں خواتین کا کردار اہم بلکہ مرکزی ہوتا ہے وہ گھر میں ناصرف صحت بخش ماحول، صحت مند غذا پر بھرپور توجہ دیتی ہیں۔ وہ صالح اقدار کے ساتھ صحیح رخ پر پرورش میں بھی اس کا کردار ہر رشتے کی صورت میں چاہے وہ ماں کا کردار ہو، بہن، بیوی یا پھر بیٹی یا بہو کا انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔
خواتین کے احترام میں شاعر علیم اسرار نے کیا خوب کہا ہے ؎

رب کی نوازشات میں پہلی ہے تو عطا
نازک سا آبگینہ تو الفت کی انتہا
تیری ہی گود بچے کی پہلی ہے درسگاہ
ایثار تیرا وصف ہے بے لوث تیری چاہ
کتنے ہی زاویوں کو بدلتی ہے اک نگاہ
مشکل میں زندگی کی منور کرے تو راہ

مرد و عورت کو نظام کائنات میں فرائض کے ساتھ حقوق بھی دیئے گئے ہیں۔ جہاں مردوں کو مختلف حقوق حاصل ہے وہیں عورتیں بھی حقوق سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ گھریلو زندگی میں انھیں حاصل حقوق جس کا استعمال وہ دلچسپ کاموں یا سرگرمیوں کی صورت میں کرتی ہے اور یہ مشغلے سلائی کڑھائی سے لے کر مختلف ہنر اور تعلیم کے حصول کے ذریعہ بھی پورے کیے جاسکتے ہیں۔

صحیح مشغلے اپنا کر آج خواتین معاشرت، معیشت، سیاست اور زندگی کے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھلا رہی ہیں۔ وہ جدید تعلیم وتکنالوجی سے آراستہ ہوسکتی ہیں یہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ آج اگر خواتین چاہیں تو اپنے فارغ اوقات کو مثبت کاموں میں استعمال کرسکتی ہیں۔ موبائل، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ کے ذریعہ فیس بک، ٹویٹر، واٹس ایپ پر خواتین کے گروپس بنا کر خدمت خلق کا کام کیا جاسکتا ہے۔ مختلف پکوانوں کی ترکیبیں شیئر کی جاسکتی ہیں۔ خواتین کی مختلف شعبہ جات کے لیے رہنمائی کی جاسکتی ہیں۔

یہی نہیں گھر سے کامیاب بزنس چلائے جاسکتے ہیں جیسے کپڑوں، جیولری، پکوان اور گھریلو ضروریات کے سامان اور دوسری چیزوں کا آن لائن بزنس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آن لائن کوچنگ لی جاسکتی ہیں۔ ساتھ ہی آن لائن کلاسوں کے ذریعے مختلف کورسیس کروائے جاسکتے ہیں۔ جن خواتین کے پاس قلم کی طاقت ہو وہ پر مغز تحاریر لکھ کر بھی خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ یوں تو آج خواتین کچن سے لے کر جہاز، راکٹ حتی کے حکومت بھی سنبھال رہی ہیں، بیشک آگے بڑھیں۔ تاریخ میں ایسی عظیم خواتین کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ نہ صرف خاندان کا بلکہ قوم وملک کا بھی نام روشن کرتی آئی ہیں۔

آج معاشرہ میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی معاشی ذمہ داریاں ادا کرتی نظر آرہی ہیں۔ گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ یہ تمام مصروفیات ہی مشغلے ہیں۔ مشغلے کو ذہنی تسکین یا پھر معاش میں مدد کے لیے ضروری اختیار کریں مگر خیال رکھیں کہ توازن ہر کام کا لازمی جز ہے۔ جب توازن بگڑتا ہے تو اس کا خمیازہ نہ صرف فرد واحد کو بلکہ اس سے جڑے سبھی لوگوں کو نہ صرف نقصان پہنچتا ہے بلکہ اسی کے ساتھ خاندان کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ بھی لاحق ہوجاتا ہے۔

خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنے شوق ضرور پورے کریں۔ بیشک مشغلے آپ کی شخصیت میں مثبت تبدیلی لاتے ہیں جس کا اثر آپ کے روزمرہ کے معمولات پر ہوتا ہے۔ اگر عورت یہ طے کرلے کہ اسے آج گھر کے تمام کام نپٹا کر کسی پروگرام میں شرکت کرنی ہے، بازار خریداری کے لیے جانا ہے یا کوئی کتاب، رسالہ پڑھنا ہے تو وہ یقیناً کرلیتی ہیں کیونکہ عورت میں قوت ارادی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے وہ فیصلہ کرکے اس پر عمل پیرا ہونے کا شدید جذبہ بھی رکھتی ہیں۔ بشرط یہ کہ شوق، یہ مشغلے کارآمد، نفع بخش ہوں۔ طویل ٹی وی و ویب سیریل یا لایعنی باتیں مسرت کا سامان مہیا تو کرسکتی ہیں مگر ان مشغولیات کو معمول بنانے سے فطری ذمہ داریوں میں مدد ہرگز بھی نہیں ملے گی اس لیے ایسے مشغلے اختیار کریں جن سے گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مدد ملے اور زیادہ بحسن وخوبی ذمہ داریاں ادا کی جاسکیں تب ہی یہ مشغلے کارگر ثابت ہوں گے اور اس مقصد کو حاصل کرنے

کے لیے سب سے اہم توازن جو کہ لازمی جز ہے۔ زمانہ قدیم میں بھی مشغولیات تھیں آج بھی ہے۔اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔بس کی اس کی نوعیت کچھ بدل گئی۔

ملازمت یا ہنر کو ذریعہ معاش بنانا یہ بھی مشغولیات اور خصوصاً آج کے دور میں تو وقت کا تقاضہ ہے۔ کچھ مشغولیات ضرورت کے تحت کی جاتی ہیں تو کچھ شوق وذوق کے تحت تو کچھ دوسری سے سبقت لے جانے کے چکر میں۔بحرحال کل ملا کر ان تمام مصروفیات کے باوجود خواتین کی اولین ترجیحات،اولین ذمہ داری یعنی قدرت کا طئے شدہ نظام کی عمل آوری وہ بھی یکسوئی اور جانفشانی اور محبت وخلوص کے ساتھ۔

خواتین سے میں یہ ضرور کہوں گی کہ وہ اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو اولیت دیں۔ ذہن وجسم کو بہت زیادہ تھکا کر مشغولیات کی انجام دہی نہ کریں جو براہ راست آپ کی صحت کو بھی متاثر کریں اور آپ کے خاندان کو بھی متاثر کریں۔ بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں مشغلے کو مشغلے کی طرح محظوظ ہوتے ہوئے اپنائیں نہ کہ اسے ذہن ودماغ پر سوار کر کے ذہنی سکون کو بگاڑ کر گھر کا سکون وافراد خاندان کے لیے تکلیف کا باعث بنیں مشغلہ شوق ہو جنون نہیں۔ یقیناً گھریلو زندگی اور مشغولیات میں توازن کامیاب زندگی کی کلید ثابت ہوگا۔

❑❑❑

Khwaja Kauser Hayat
Syed Athar Ahmed
Flate No.8, Safa Complex,
Kala Darwaza
Aurangabad-431001(M.S)
Mob: 9373193908, 8446731081

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................... بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

فردوس جہاں

عورتوں کے مسائل اور موجودہ حکومت کے اقدامات

آزادی کے 75 برس مکمل کرتے ہوئے ہم اپنی کامیابیوں کا جشن منا رہے ہیں۔ اس تناظر میں آدھی دنیا یعنی خواتین کے مسائل اور موجودہ حکومتی اقدامات کو سمجھنا بھی اپنے آپ میں اہم ہے۔

خواتین نے مردوں کے شانہ بہ شانہ آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ ارونا آصف علی، کملا دیوی چٹوپادھیائے، کیپٹن لکشمی سہگل اور سچیتا کرپلانی وغیرہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آزادی کے بعد ابتدائی برسوں میں خواتین کے زبردست تعاون کی بدولت اچاریہ ونوبا بھاوے کو تلنگانہ میں جاگیردارانہ نظام اور حکومتِ نظام کے خلاف کامیابی مل سکی۔ بندھوا مزدوری کا خاتمہ ممکن ہوا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، بھارتی جمہوریت سے خاصی پرانی جمہوریت ہے لیکن وہاں کسی خاتون کو صدر مملکت نہیں بنایا گیا جبکہ ہم نے اب تک خاتون وزیراعظم، خاتون اسپیکر اور خاتون صدر مملکت کے انتخاب کے ذریعے جمہوریت کو عملاً نافذ کرکے دکھایا ہے۔ جولائی 2022 میں دروپدی مرمو جی کا بطورِ صدر جمہوریہ انتخاب کے ذریعے ہم نے دنیا کو دکھادیا کہ ایک خاتون بھی صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہو سکتی ہے۔

خواتین کے مسائل کے حل کے لیے حکومت مسلسل کوشاں ہے حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کے مسائل اور ان کے حل کے لیے علاحدہ وزارت، وزارت برائے بہبود خواتین و اطفال 2006 میں تشکیل دی گئی۔ اس وزارت کے تحت بچوں اور عورتوں سے متعلق منصوبے اور پروگرام تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں موجودہ حکومت نے زبردست کامیابیاں حاصل کی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(1) بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ:

حکومت کا مشہور 'بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ' پروگرام 2015 میں شروع کیا گیا۔ اس اسکیم کا اہم مقصد بچیوں کی حفاظت و نگہداشت، خصوصاً بچوں کے جنسی تناسب کو برقرار رکھنا تھا۔ اس اسکیم کو تین وزارتوں، وزارت

برائے خواتین واطفال، وزارت برائے صحت و خاندانی بہبود اور وزارت برائے تعلیم نے مل کر نافذ کیا۔ اس اسکیم کو مرکزی حکومت نے 100 فیصد فنڈ فراہم کرکے اسے ملک کے 640 اضلاع میں نافذ کیا۔ اس اسکیم کے کامیاب نفاذ کے نتیجے میں جنسی تناسب میں 19 پوائنٹ کا اضافہ ہوا۔ 15-2014 میں جنسی تناسب 1000 بچوں پر 918 بچیوں کا تھا جو 21-2020 میں بڑھ کر 937 ہو گیا۔

(2) پردھان منتری ماترو وندنا یوجنا:

خواتین کی زچگی اور دودھ پلانے والی ماؤں کو مالی تعاون دینے کے لیے حکومت نے پردھان منتری ماترو وندنا یوجنا کی شروعات کی جس کے تحت اس مدت میں پہلی با حیات اولاد ہونے پر حکومت نے 5000 روپے براہ راست ماں بننے والی خواتین کے بینک اکاؤنٹ یا پوسٹ آفس کھاتے میں ٹرانسفر کیے۔

(3) پوشن ابھیان:

بچوں میں غذائی تغذیہ کی کمی سے ہونے والی بیماریوں کے خاتمے کے لیے 'پوشن ابھیان' کی شروعات کی گئی۔ جس کے تحت بچے کے ابتدائی 1000 دن کو ٹارگیٹ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ماہ ستمبر کو 'پوشن ماہ' کے طور پر منانے کی شروعات کی گئی ہے۔ اس کے لیے جدید ٹکنالوجی کا بھی سہارا لیا گیا۔ Poshan Tracker کی مدد سے ماں اور بچے کی صحت، تغذیہ، مدافعت وغیرہ کو Track کیا جاسکتا ہے۔

روزمرہ میں عورتوں کو درپیش مسائل کے حل کے لیے بھی حکومت تیزی سے فیصلے لے رہی ہے۔ سماجی ذہنیت اور دیگر کئی عوامل کے سبب جدید دور میں عورتوں کو تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گھریلو تشدد کا سامنا کرنے پر خاتون کو فوری امداد کی فراہمی کے لیے One Stop Centre کا قیام کیا گیا ہے۔ سینٹر میں FIR داخل کرنے اور قانونی امداد کے ساتھ طبی امداد بھی فراہم کی جارہی ہے۔ 733 منظور شدہ One Stop Centre میں سے کل 704 سینٹر اپنا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

(4) ہیلپ لائن کا قیام:

خواتین کو کسی ایمرجنسی کی صورت حال میں مدد فراہم کرنے کے لیے یورپی ممالک کے طرز پر مختصر ہیلپ لائن نمبر شروع کیا گیا ہے۔ ہیلپ لائن کے مختصر نمبر کے لیے ٹیلی کام محکمہ نے تعاون کرتے ہوئے ہیلپ لائن نمبر 181 فراہم کیا گیا ہے۔ اس ہیلپ لائن کو مختلف ریاستوں اور مرکز کے زیر اہتمام علاقوں میں نافذ کیا گیا ہے۔ مثلاً آندھرا پردیش، اروناچل پردیش، چھتیس گڑھ، چنڈی گڑھ، دہلی، مدھیہ پردیش، گجرات، کیرالا، اتراکھنڈ، میزورم، جھارکھنڈ، بہار، پنجاب، مہاراشٹر، اڑیسہ، اترپردیش، میگھالیہ، ہریانہ، ناگالینڈ، مغربی بنگال، اور سکم میں نافذ کیا گیا ہے۔

(5) موبائل فون میں Panic Button:

خواتین کو درپیش ایمرجنسی حالات پر قابو پانے اور امداد پہنچانے کے لیے وزارت برائے اطفال و خواتین نے ڈپارٹمنٹ آف ٹیلی کمیونیکیشن سے Panic Button and Global Positioning System in Mobile Handsets Rules - 2016 نوٹیفائی کروایا۔ جس کے ذریعے نئے تیار کردہ موبائل فون میں Panic Button کی شروعات کی گئی ہے۔ اس طرح 5 یا 9 نمبر کی بٹن دبا کر GPS کی مدد سے ایمرجنسی مدد کے لیے کوشش کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اسمارٹ فون میں آن آف کی بٹن کو تین مرتبہ دبا کر مدد طلب کی جاسکتی ہے۔

(5) مہیلا پولس والنٹیر:

نربھیا فنڈ اور وزارتِ خواتین واطفال و وزارتِ داخلہ کی مدد سے خواتین کی مدد اور گھریلو تشدد، بچپن کی شادی، جہیز سے متعلق ہراساں کرنا وغیرہ پر قابو پانے کے لیے مہیلا پولس والنٹیر کی شروعات کی گئی ہے۔ اس اسکیم کو آندھرا پردیش، انڈومان ونکوبار، چھتیس گڑھ، دادرانگر حویلی، گجرات، ہریانہ، جھارکھنڈ، کرناٹک، مدھیہ پردیش، میزورم، ناگالینڈ، تری پورہ اور اتراکھنڈ میں منظور کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وزارتِ داخلہ کی جانب سے

ریاستوں کو ایڈوائزری جاری کی گئی ہے جس میں پولس فورس میں خواتین کی تعداد 33 فیصد تک بڑھانے کی بات کی گئی ہے۔

ان اقدامات کے ساتھ ساتھ بیواؤں اور مختلف حالات میں گھری خواتین کے لیے 'سوادھار گرہ' Swadhar Greh اسکیم شروع کی گئی ہے۔ کام کرنے والی خواتین کے لیے Working Women Hostel Scheme بھی شروع کی گئی ہے۔

(7) تیزاب پاشی متاثرین کو معذوری کا درجہ دینا:

تیزاب پاشی متاثرین کو امداد بہم پہنچانے کے لیے انھیں معذوری کا درجہ دینے کے لیے وزارت برائے خواتین واطفال نے وزارت برائے سماجی انصاف سے درخواست کی کہ ان متاثرین کو Disabilities میں شمار کیا جائے، اس کی کوشش کی گئی اور Rights of Persons with Disabilities Act - 2016 (جسے 2016 میں نافذ کیا گیا ہے) میں تیزاب پاشی سے متاثرین کو بھی Disability کا درجہ دیا گیا ہے کہ وہ حکومت کی مختلف اسکیموں سے مستفیض ہوسکیں۔

(8) میت کے داخلے پر بیوہ کے نام کا اندراج:

وزارت برائے خواتین واطفال نے رجسٹرار جنرل آف انڈیا کے ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا کہ تمام ریاستوں میں اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ شوہر کی موت کے بعد اس کے میت کے داخلے یعنی Death Certificate پر بیوہ کے نام کا بھی اندراج کیا جائے۔ ساتھ ہی 1000 بیواؤں کی رہائش کے انتظام کے لیے ورنداون میں 1424 ہیکٹر کے رقبے پر رہائشی مکانات کی تعمیر کی جارہی ہے۔

(9) پاسپورٹ کے لیے نئے قوانین:

2016 میں جاری کئے گئے New Passport Rule - 2016 کے مطابق پاسپورٹ میں باپ کے نام کا اندراج ضروری نہیں ہے اور نہ ہی شادی یا طلاق کا سرٹفکیٹ جوڑنا لازمی ہے۔ اس نئے اصول کے مطابق پاسپورٹ بنانے میں بیوہ، مطلقہ یا علاحدہ رہنے والی ماؤں کو ہونے والی پریشانی دور ہوگئی ہے۔

(10) خواتین کے لیے پنچایت راج ٹریننگ:

حکومتی اداروں میں خواتین کی شمولیت کو بڑھاوا دینے اور جنسی تفریق کو ختم کرنے کے لیے خواتین کے لیے Reservation کی پالیسی پر عمل کیا گیا ہے۔ مقامی خود اختیاری اداروں میں خواتین کے لیے نشستیں مختص کی گئی ہیں لیکن ٹریننگ اور معلومات نہ ہونے کی وجہ سے خواتین اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کر پارہی ہیں۔ اس دشواری کو ختم کرنے کے لیے گاؤں کی پنچایتوں میں خواتین سربراہوں کی ٹریننگ کا نظم کیا گیا ہے۔

2 لاکھ پنچایتوں کی خواتین سربراہوں کے لیے ٹریننگ کا نظم وزارت برائے خواتین واطفال اور وزارت برائے دیہی ترقی نے 2016 میں شروع کیا۔ اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں وزارت برائے پنچایتی راج بھی مدد کررہی ہے۔

(11) Maternity Leave میں اضافہ:

Maternity Benefit Act, 1961 میں عورتوں کی سہولت کے لیے ترمیم کی گئی ہے۔ نئی ترمیم کے مطابق Maternity Leave کو 12 ہفتوں سے بڑھا کر 26 ہفتے کردی گئی ہے۔ ساتھ ہی مختلف اداروں، فیکٹریوں اور دفاتر میں چھوٹے بچوں کے ساتھ کام کرنے والی خواتین کے لیے کریچ سینٹر بنانے کی بات کی گئی ہے۔

(۱۲) کام کی جگہوں پر جنسی ہراسانی کے خلاف قانون میں سختی:۔

Sexual Harassment of Women at Workplace (Prevention, Prohibition and Redressal) Act 2013 کے تحت مختلف محکمے، ریاستی اور مرکزی حکومتوں کو ہدایت جاری کی گئی ہے اور ہینڈ بک کے ذریعے اس قانون کے استعمال کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔

ان اسکیموں کے علاوہ خواتین کے لیے قومی پالیسی 2016 کا مسودہ آخری مراحل میں ہے۔ اس پالیسی پر 15 سالوں کے بعد نظر ثانی کی جارہی ہے اور اسے اس طرح بنایا جارہا ہے کہ آئندہ پندرہ بیس برسوں تک ان اصولوں اور قوانین کے ذریعے عورتوں کی حفاظت اور ان کے لیے بہتر ماحول فراہم کیا جاسکے۔

حکومت عورتوں کے حقوق، ان کی حفاظت کے سلسلے میں نہایت سنجیدہ ہے اور کوشش کررہی ہے کہ اس سلسلے میں سماج ان قوانین کے اطلاق کے لیے ان کی مدد کرے۔ حکومت اپنا کام کررہی ہے اور بہت ہی اچھے انداز میں ان قوانین کو سختی سے نافذ کیا جارہا ہے۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بچیوں کو اچھی تعلیم دیں، بھرپور تغذیہ والی غذائیں فراہم کریں اور انہیں احساس دلائیں کہ وہ بھی بہت اہم ہیں۔

□□□

Firdaus Jahan
Plot. No 91, Survey No. 114/1
Near Pawarvadi Police Station
Malegaon-423203 (M.S)

اعترافِ ہنر

سائرہ عظیم

جدید فکر و آگہی کا شاعر
فریاد آزر

فریاد آزر ان معتبر شعرا میں سے ہیں جن کی شناخت ان کے مخصوص ڈکشن کی وجہ سے ہوئی ہے۔فریاد آزر کے اس ڈکشن کی حصولیابی میں وسیع معنوی نظام کے ساتھ ساتھ انفرادی طبیعت نے بھی ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ڈاکٹر فریاد کی کاوش فکر و فن کی اس منزل پر کھڑا کرتی ہے جہاں افہام و تفہیم کا مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ان کی شاعری مشینوں کے شور میں دل کی دھڑکنوں کی آواز ہے۔ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ احساس ظاہر ہوتا ہے کہ دل سے کی جانے والی شاعری کتنی خوبصورت اور پر اثر ہوتی ہے۔ان کا ''ایلیئن'' تازہ مجموعہ زیرِ نگاہ ہے۔اس سے پیشتر قسطوں میں گزرتی زندگی،خزاں میرا موسم،بچوں کا مشاعرہ اور کچھ دن گلوبل گاؤں میں شعری مجموعے نظروں سے گزر چکے ہیں اور اردو دنیا میں سراہے گئے۔ان تمام مجموعوں کی اشاعت نے ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی۔فریاد آزر نے اپنی شاعری کے منظر نامے کو چھان پھٹک کر تہذیبی،سماجی،اخلاقی قدروں کے تعین میں ہوش مندی کا بیّن ثبوت دیا ہے۔

شعوری انحراف اور فطری عمل کے درمیان ڈاکٹر صاحب نے سفرِ آئندہ کے لیے جس منزل کا انتخاب کیا وہ ذات کی تہ سے نکل کر وسیع و عریض کائنات کی پر اسراریت کا مطالعہ تھا۔انہوں نے عروضی اعتبار سے بھی مختلف شعری تجربے کر کے غزل کی اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔اس طرح سے ان کی شعری ریاضت کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ان کی استادانہ صلاحیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

عشق و محبت غزل کا خاص موضوع رہا ہے۔یہ وہ جمالیاتی حس ہے جس سے کوئی فرد بھی خالی نہیں۔اس لیے ہر زمانے میں شاعر نے اس جذبہ کا اظہار مختلف زاویۂ نگاہ سے کیا ہے۔نوجوانوں میں بھی اس کا اظہار کثرت سے ملتا ہے۔نئے تقاضوں کے پیش نظر اسلوبیاتی سطح اس کا رنگ روپ جداگانہ ہے اور نئے طرزِ احساس کی وجہ سے اس کا ذائقہ بھی مختلف ہے۔

دورِ حاجر میں زلیخائے سیاست کے عوض
کون یوسف ہے جو بے وجہ گرفتار نہیں؟

جب ذہن ڈھونڈتا رہا فن کی جمالیات
دل کو لبھا رہی تھی بدن کی جمالیات

ماتحت عقل کے اب اور نہیں رہ سکتے
دل کے جذبات بغاوت پہ اتر ائے ہیں

جہاں روحانیت اپنی حدوں کو ختم کرتی ہے
وہیں آغاز ہوتا ہے بدن کی لازمیت کا

وہ سیاست نے دیا ہو کہ محبت نے تری
زخم اس دل کو ضرورت سے زیادہ ہی ملا

مسائل سے الجھنا شان مردوں کی سہی لیکن
نہ ہو گر تذکرہ تیرا، غزل پوری نہیں ہوتی

ہے جس کا نام زمانہ میں عشق، یہ دل بھی
مرید خود کو اسی پیر کا بتاتا ہے

دلِ عزیز پہ دعوا ہے آج بھی اس کا
اسے وہ مسئلہ کشمیر کا بتاتا ہے

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر فریاد آزر کی غزلیات میں بھی تغزل کا عنصر ہے۔ فطری طور پر بھی یہی ممکن ہے۔ پیار محبت ہماری جذباتی زندگی کا عنصر ہے اور کوئی بھی اہلِ دل اس سے مبرا نہیں رہ سکتا۔ اس طرح سے شاعر کے تغزل میں شدت ہے اور ان کا لہجہ درشت ہے۔

ڈاکٹر فریاد آزر کو اردو کے شعری ورثہ کا احساس زیادہ ہے اور وہ خاصے ضبط و احتیاط کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہیں تبھی تو غزل کو اعتدال، توازن، متانت، اور ٹھراؤ سے ہم آہنگ کرنے والے شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی غزلیات میں شستگی اور شائستگی پائی جاتی ہے۔ وہ جب اردو غزل کی روایت کو اپناتے ہوئے جدید لہجے کو اختیار کرتے ہیں تو ان کے اشعار بڑے تیکھے اور طرحدار لگتے ہیں۔ ایسے بھی اشعار ملاحظہ کیجئے جوان کے قاری کو چونکاتے ہیں۔

ذہن تو پہلے ہی قائل تھا سخن فہمی کا
اور دل نے بھی رخِ حضرتِ نارنگ کیا

سفید ہونے کا نقصان اس قدر تھا اسے
وہ اپنے بچوں کی شکلیں سیاہ کرنے لگا

ہے چاند، رات کے ماتھے کا خوبرو جھومر
ستارے کیا ہیں کہ گویا کوئی حمائلِ شب

اندر کا شیطان مجھے اب بھی اکساتا رہتا ہے
جس نے مجھ کو گالی دی تھی میں بھی اس کو گالی دوں

لوگ راون کے پنرجنم سے واقف ہی نہیں
کتنے معصوم اسے رام سمجھ بیٹھے ہیں

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فریاد آزر کی شاعری میں نبض، زیست کی دھڑکنیں پائی جاتی ہیں۔ پہلے شعر میں انہوں نے اپنے محترم استاد سے دلی لگاؤ کا اظہار کیا ہے، دوسرے شعر میں سرکاری اور غیر سرکاری نوکریوں میں ریزرویشن کی وجہ سے عام طبقہ ملازمتوں سے ہاتھ دھو رہا ہے اور اس وجہ سے اعلا طبقہ کے لوگ بھی خود کو ریزرویشن کی کیٹگری میں لانے کے لیے چھوٹی ذات کا سرٹی فکٹ بنوانے لگے ہیں، اسے آزر صاحب نے سفید و سیاہ کے حوالے اشارہ اشارہ میں کہنے کی خوب کوشش کی ہے۔ اگلے شعر میں شاعر نے رات کی خوبصورتی اپنے دلچسپ شاعرانہ انداز میں بیان کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان میں فرشتوں اور شیاطین دونوں کی خصلتیں بھی موجود ہیں۔ یہی انسان کبھی فرشتہ صفت کہلاتا ہے تو کبھی شیطان۔ اس کشمکش کا اظہار اگلے شعر میں ملتا ہے۔ آخری شعر میں رام اور راون کے حوالے سے آج کے دور کے سب سے بڑے تلخ سچ کو اجاگر کیا ہے۔ جدید غزل کی ایک خوبیا اور اس کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ زندگی کے کرب و بلا، انتشار و اختلال، تلخیوں اور زہرناکیوں اور حالات و حوادث کی عمدہ تصویریں اس میں مل جاتی ہیں۔ اس سچائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شاعر کا کلام خود اس کے مشاہدات اور تجربات کی تفسیر ہوتا ہے۔ رسمی انداز کی شاعری میں ایسے موضوعات شعر میں مل جاتے ہیں جن سے فن کار کا اپنے طور پر کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس طرح کے اشعار خود بخود ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فریاد آزر کی عصری حسیت بیدار ہے، وہ اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اپنے ذہن سے سوچتے ہیں اور اپنے ذہن سے بولتے ہیں تب کہیں جا کر ایسے بہترین اشعار کی تجسیم کر پاتے ہیں۔ وہ روایات کا واقعی شعور رکھتے ہیں اور کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ اس لیے نئے میلانات اور رجحانات کو اپنے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

فریاد آزر کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے خاصہ اثر قبول کیا ہے۔ برجستگی، شستگی اور بے ساختگیان کی زبان کے وہ جوہر ہیں کہ داد ان کا حق ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی قدریں ابھر رہی ہیں۔ اس طرح شاعر نئی جہتوں کی بشارت دیتا ہے۔ شاعر مستقبل کی آہٹوں سے باخبر ہے۔ وہ قافلہ جو اپنی منزل تک نہیں پہنچا ہے وہ اس کی راہ میں نئے چراغوں کو روشن کر رہے ہیں۔

Saira Azeem
B-322, Street No. 5
Mandawali Fazil pur
Delhi-110092
Mobile No : 7827642612

زاہد ظفر

زنفر کھوکھر

بحیثیت انشائیہ نگار

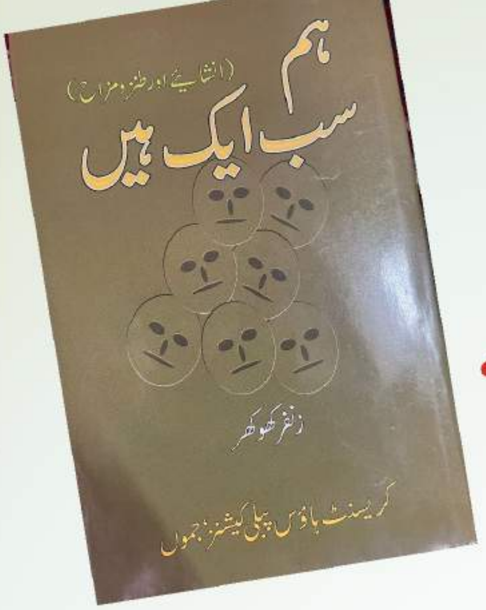

جموں وکشمیر میں اُردو کی ہر ایک صنف کی آبیاری ہو رہی ہے۔لیکن کچھ اصناف ایسی بھی ہیں جن کے لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے بہت سارے ادیب ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس صنف میں لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو پائے چند ایک انشائیوں سے آگے نہیں بڑھ پائے اور اس صنف کو خیر باد کہہ دیا۔صنف انشائیہ کا حال ہمارے جموں وکشمیر میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک (ہندوستان) میں یہی ہے۔لیکن ایک بات جموں وکشمیر کے ادیبوں کے لیے فخر کی یہ بھی ہے کہ یہاں کے انشائیہ نگار عالمی شہرت رکھتے ہیں جن میں ایک نام پروفیسر محمد زماں آزردہ کا ہے جو ہندوستان کے چوٹی کے انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

جہاں تک جموں وکشمیر میں خواتین انشائیہ نگاروں کی بات کی جائے تو پورے جموں وکشمیر میں زنفر کھوکھر ہی واحد خاتون ہیں جو انشائیہ لکھتی ہیں حالانکہ وہ ایک بہترین افسانہ نگار بھی ہیں لیکن ان کے افسانوں پر بھی انشائیہ کا رنگ غالب ہے۔زنفر کھوکھر کی پیدائش 1957 میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات 1999 میں کی۔ابھی تک ان کے تین افسانوں کے مجموعے اور ایک انشائیوں کا مجموعہ بعنوان ''ہم سب ایک ہیں'' 2016 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں ان کے پچیس (25) انشائیے شامل ہیں اور جلد ہی ان کا دوسرا انشائیوں کا مجموعہ قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔زنفر کھوکھر نے بڑی سنجیدگی سے اس صنف کو برتا اور کہیں نہ کہیں اس میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ان کے انشائیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت ہی معمولی واقعات سے وہ انشائیوں میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی چیز نے ان کے انشائیوں کا تاثر برقرار رکھا ہے۔

موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ان کا ہر ایک انشائیہ متاثر کیا جا سکتا ہے۔وہ شاید اس لیے بھی کہ مصنف کو زندگی کے تجربات سے پوری آگاہی ہے جو ان کے انشائیوں میں صاف صاف نظر آتی ہے۔ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال زنفر کھوکھر کے انشائیوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

> ''زنفر نے بڑے پُر وقار اور خوشگوار انداز میں اپنے عہد کی برائیوں کو ہدف بنایا ہے۔وہ کم آبادی والے پہاڑی علاقے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اُن کی فکر اور انشائیوں کا کینوس وسیع ہے اور اُن کا مشاہدہ ہم عصر شعور اور عصری حیثیت کا غماز ہے۔وادیٔ کشمیر کی شگفتگی اور تازگی اُن کے اسلوب اور مزاح پر حاوی ہے۔انشائیوں میں طنز کے جوہر اور مزاح کے جھٹکے ٹانکنا زنفر کو خوب آتا ہے۔''

(ہم سب ایک ہیں، زنفر کھوکھر، سن اشاعت 2016، ص نمبر 10-9)

زنفر کھوکھر نے اپنے انشائیوں کا موضوع اپنے اردگرد کی ان عام چیزوں کو بنایا ہے جنھیں ہم اپنی روزمرہ کے کام وکاج میں استعمال کرتے ہیں انھوں نے ان چیزوں پر اپنے خیالات اور تجربات کی ایسی پیوندکاری کی ہے کہ قارئین کے سامنے اُن چیزوں کے الگ الگ نقشے بننے لگتے ہیں۔اس طرح کے انشائیوں میں ان کا ایک بہترین انشائیہ ''جوتا'' بھی ہے۔

زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔موجودہ دور میں انسان نے اپنی آرام و آسائش کی چیزوں کے دام اور ان کا مقام اونچا کر دیا ہے۔جبکہ جن چیزوں سے وہ زندگی کے فلسفے اور قابلیت حاصل کر کے اس مقام تک پہنچا ان چیزوں کی قیمت اور مقام دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے۔اس چیز کے فرق کو

سمجھنے کے لیے ہمارے پاس بہترین مثال یہ ہے کہ موجودہ دور میں جوتوں کو بڑے بڑے شوروم میں بڑے ہی پیارے انداز میں سجائے رکھا ہے اور قیمتیں آسمان چھورہی ہیں۔ وہیں کتابیں نہ تو کسی شوروم میں ملیں گی نہ ہی ان کی قیمتیں ان کی اہمیت کے مطابق ہیں۔ کتاب ایک سادہ سی دکان اور باہر سڑکوں پر لگائے جانے والی ریڑوں پر بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ زنفر کھوکھر کا انشائیہ ''جوتا'' میں جوتے کی اور بھی بہت ساری خاص اور اہم خصوصیاتوں سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ وہ جوتے کو انسان کے دُکھ وسکھ کا ساتھی مانتی ہیں۔ لکھتی ہیں انسان ننگے سر تو چل سکتا ہے لیکن ننگے پاؤں نہیں یہ انسان کی شخصیت کو خوبصورت بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے اور ہر دور میں ہر طرح سے انسان کا معاون اور مددگار ثابت ہوا ہے۔ انشائیہ ''جوتا'' سے ایک اقتباس۔

> ''جوتے کا حلقہ کاروبار اور کام کاج بھی بہت وسیع ہے۔ جوتا قد بڑھانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کسی سے کوئی کام پڑ جائے تو جوتے گھسا کر کام نکالا جاسکتا ہے۔ ناچنے، نچانے اور دوڑ بھاگ کرنے میں جوتا اہم رول ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں دال کے لیے برتن کم پڑ جائیں تو جوتوں میں دال بانٹی جاسکتی ہے۔ تو بہ تائب کرنے کے لئے جوتے پر ناک رگڑی اور رگڑائی بھی جاسکتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر کسی کی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ کرنا مقصود ہو تو اس کی پگڑی اُچھالنے کے بجائے اُس پر جوتا بہ آسانی اُچھالا جاسکتا ہے''

(ہم سب ایک ہیں، زنفر کھوکھر، سن اشاعت۔2016، ص26)

یہ بات تو سچ ہے ہی کہ جوتے سے انسان کی شخصیت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جوتا اگر کسی مجلس میں کسی پر مارا جائے تو اس کی عزت گر جاتی ہے۔ انشائیہ ''جوتا'' سے ایک اقتباس۔

> ''کہا جاتا ہے کہ اب کوئی بھی کانفرنس، کوئی بھی جلسہ یا اجتماع جوتے کے خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ اور کوئی بھی چھوٹی یا بڑی شخصیت، جسے اسٹیج سے بولنا پڑے، اُسے یہ خطرہ لاحق رہے گا کہ کہیں سے اُس پر جوتے سے وار نہ ہوجائے۔''

اب اگر کوئی نیا جوتا خرید لے تو اُس سے اس کے چوری ہونے کا ڈر بھی رہتا ہے۔ اور اگر اس نئے جوتے پر مٹی یا، کیچڑ لگ جائے تو بار بار صاف کرنا ہر کسی کی عادت بن چکی ہے۔ جوتے سے انسان کو بڑی ہی محبت ہے۔ مسجد میں نیا جوتا لے کر چلے گئے تو نماز میں بھی یہی خیال ستاتا ہے کہ کہیں باہر رکھا جوتا چوری نہ ہوجائے اور اگر جوتا چوری ہوجائے تو دس دن میں انسان اس غم میں مبتلا رہتا ہے۔ انشائیہ سے ایک اقتباس۔

> ''جوتے کی اہمیت وضرورت کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نماز ادا کرنے کے دوران مسجد سے جوتے چرائے جاتے ہیں۔ دراصل اب جوتا بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکا ہے۔''

(ہم سب ایک ہیں، زنفر کھوکھر، سن اشاعت 2016، ص29)

کرسی لکڑی، لوہے یا پلاسٹک سے بنی ایک معمولی سی چیز دیکھنے میں لگتی ہے لیکن اس کی اہمیت اس کے بنے ہوئے شیپ یا اس میں استعمال شدہ چیزوں سے پتہ نہیں چلتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کرسی کے لیے بڑے بڑے تخت اُلٹا دئے گئے قومیں مٹ گئیں لیکن اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ دن بہ دن اس کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے مصنفہ نے اس موضوع کرسی پر لکھے انشائیہ میں کرسی کی بہت ساری خصوصیات اور انفرادیت کو بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ کرسی کی اہمیت انسانی جان سے کہیں زیادہ ہے وہ سوال پوچھتی ہیں کہ انسان رتبہ میں بڑا ہے یا کرسی میں؟

اس کا جواب کرسی سے اُترے ہوئے حضرات کی حالت زار دیکھ کر آسانی سے دیا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور کے انسان کو کرسی کی لت اتنی لگ چکی ہے کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد سے گزر جاتا ہے۔ وقت بھی کتنا بدل چکا ہے اب تو کرسی حاصل کرنے کے بعد کا سب سے مشکل کام اس کی حفاظت کا ہوتا ہے کیونکہ اس کرسی کے مالک سے تھوڑی سے بھی غفلت ہوئی تو اُسے دھڑام کر کے نیچے اُتار دیا جاتا ہے، انشائیہ سے ایک اقتباس۔

> ''آج کل لوگ نیچے سے کرسی سرکانے اور پیچھے سے کُرسی کی ٹانگ کھینچ کر دھڑام سے نیچے گرانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ صرف یہی نہیں، وہیں سے گھیر گھار اور گھسیٹ کر کورٹ کچہری تک لے جانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ کرسی پر بیٹھ کر ایک طرح سے حکومت کی جاتی ہے۔ لہٰذا حکومت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کُرسی کو اور خاص طور سے اُس کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھا جائے۔''

ہم سب ایک ہیں رزنفر کھوکھر رسن اشاعت 2016رص35''

زنفر کھوکھر کے بہترین انشائیوں میں ایک انشائیہ ''گالی'' بھی ہے جس میں انھوں نے گالی کی اہمیت کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

کچھ باتیں سننے میں عجیب لگتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ عجیب نہیں ہوتی جیسے کہ گالی دینے کے بہت سارے فائدہ ہیں اب سننے میں تو عجیب لگتا ہے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو فائدے بھی بہت ہیں جیسے اپنی من کی بھڑاس کسی کو گالی دے کر بھی نکالی جاسکتی ہے۔ ہاتھا پائی سے ڈر لگتا ہو تو گالی دے کر غصّہ ٹھنڈا بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی گالی سن کر برداشت کرلے تو اُس کی قوتِ برداشت کی لوگ داد دینے لگتے ہیں۔ یوں مان لیجیے گالی بڑے بڑے حادثات کو ٹالنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ انشائیہ گالی سے چند اقتباسات۔

(1) ''یوں گالیاں بڑے حادثات کو ٹالنے کے کام بھی آتی ہے۔ گالی کو بروئے کار لاکر ڈنڈا یا دیگر نوعیت کا کوئی ہتھیار اُٹھانے سے بچا جاسکتا ہے''(ص نمبر 52)

(2)''عقل مند لوگ پٹنے اور پٹانے کے بجائے صرف گالیوں کے لین دین پر ہی اکتفا کرلیتے ہیں''(ص نمبر 53)

(3) ''دراصل گالی وہ کارگر ہتھیار ہے جو بغیر لائسنس کے ہمہ وقت آپ کے ساتھ رہتا ہے اور یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کب، کیسے اور کن مواقع پر اور کتنی مقطور میں اس کا استعمال کرتے ہیں''

(ہم سب ایک ہیں ر زنفر کھوکھر رسن اشاعت 2016 رص 51)

انشائیہ 'مظلوم' مصنفہ کا ایک بہترین انشائیہ ہے۔ مصنفہ نے اس انشائیہ میں شوہر کی بے بسی اور لاچاری کو موضوع بنایا ہے دنیا میں سب سے مظلوم اور بے بس عورت کو ہی سمجھا جاتا رہا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عورت اپنے حقوق جان چکی ہے اور حاصل بھی کرچکی ہے لیکن یہ مظلومیت کا ٹیگ اس کے نام سے ایسا چپکا کہ جانے کا نام ہی نہیں لیتا لیکن مصنفہ نے اپنے انشائیہ میں عورت سے بھی مظلوم اگر کسی کو دیکھا ہے تو وہ شوہر ہے۔ ان کی نظر میں شوہر دنیا میں سب سے زیادہ مظلومیت کا شکار ہے۔ انشائیہ سے اقتباس۔

''بہر حال ان سب سے ہٹ کر دیکھا جائے اور بالخصوص عورتوں کے حد مقابل دیکھا جائے تو ہمیں جو سب سے زیادہ مفلوک الحال اور مظلوم مخلوق نظر آتی ہے وہ شوہر حضرات کی ذاتِ گرامی ہے''

(ہم سب ایک ہیں ر زنفر کھوکھر رسن اشاعت 2016 رص 63)

یہ شوہر سب سے زیادہ مجبور اور مظلوم تب نظر آتا ہے جب بیوی کی طرف سے مائکے چلے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے ا۔س کے علاوہ جب بیوی اپنی خواہش یا ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس کی پوری جیب صاف کردیتی ہے تب شوہر مظلوم نظر آتا ہے۔ اب اگر کبھی بیوی کے ہاتھوں شوہر زدوکوب بھی ہوجائے وہ یہ فریاد کر کہیں نہیں جاسکتا کیونکہ اسے اپنی مردانگی پر سوال اُٹھنا پسند نہیں اب اس سے زیادہ مظلومیت کیا مثال ہوسکتی ہے۔ مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ جب شوہر بیوی کی گالیاں سنتا ہے تو وہ انھیں کسی اوزار کی مار سے کم نہیں لگتی۔ وہ گالیاں اس کے جگر کے آس پاس ہوتی ہیں ان کی چبھن تلوار کی نوک چبھنے سے بھی زیادہ اثر دار ہوتی ہے۔ وہ ان گالیوں سے بچنے کے لیے بیوی سے دور دور اور ڈرا ڈرا سا رہتا ہے۔ اب تو سرکار نے خانگی تشدد مخالف قانون بھی بنا لیے ہیں اب تو شوہر مظلومیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ایک قیدی بن چکا ہے۔ انشائیہ مظلوم سے ایک اقتباس۔

''جب سے خانگی تشدد مخالف قانون بنا ہے، شوہر کی ذات گرامی اور معصوم اور مظلوم ہوکر رہ گئی ہے۔ مانا کہ یہ قانون عورتوں کے لئے نہایت حوصلہ افزا ثابت ہورہا ہے۔ اس قانون کی مدد اور شیہ پاکر بہت سی عورتیں طلاق پانے میں کامیاب رہی ہیں۔''

(ہم سب ایک ہیں ر زنفر کھوکھر رسن اشاعت 2016 رص 65)

زنفر کھوکھر جموں وکشمیر کی ایک ابھرتی ہوئی انشائیہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ اس طرح بیاں کیا ہے جو قاری کے لیے اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ ان کے بہترین انشائیوں میں ''زبان'' ناک، دانت، دشمن، آس کا دامن، کُتے کی دُم، تعریف قابل ذکر ہیں۔ اُمید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ وہ اپنے نوک قلم سے اُردو انشائیہ کے گیسو سنواریں گی اور جموں وکشمیر کی دوسری خواتین قلم کاروں کے لیے مشکل راہ بنیں گی۔

□□□

Zahid Zaffar

Research Scholar

VBU Hazaribagh

Keller Shopian, tehsil, shopian

District Shopian-192302

9906700711

zahidzaffar@70@gmail.com

میمونہ علی چوگلے

نظم

"گوکھلے برج"

بارش آتی ہے تو
ممبئی نکھری نکھری سی لگتی ہے
رین کوٹ اور چھاتوں کے ساتھ ساتھ
گاڑیوں کی ریل پیل
کچھ ہی دنوں میں ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے

پر آج تو
ایسا کچھ ہوا کہ
سارا شہر تتر بتر ہو گیا
"اندھیری کا برج" صبح سویرے ہی گر پڑا
شاید دن کا بوجھ اٹھانا چاہتا ہی نہیں تھا
ریل کی پٹری پر ملبے کا ڈھیر
اور

سویرے سویرے ڈیوٹی پر نکلے زن و مرد
اپنی اپنی جانیں بچائے بھاگ رہے تھے
وہ بھی ان میں شامل تھا
بھونچکا سا کھڑا دیکھ رہا تھا
آسمان کی طرف
خدا کو ڈھونڈ رہا تھا
کیوں کہ
اسی پٹری کے پاس
گھر سنسار اسی کا تھا—'!!

Mrs. Maimuna Ali Chougle
304-B, Panch Dhara
Panch Marg, Versova
Mumbai 400061(M.S)

غزلیں

فرحت نادر رضوی

دیکھتا ہے جو پس پردہ محفل تجھ کو
شکوہ کرتا ہے سنا کر دل بسمل تجھ کو
روز و شب اتنے تقاضے کیے دیوانوں نے
کر دیا طرز عنا یات سے غافل تجھ کو
عشق کرنا ہے مگر ہدیہ جاں کمتر ہے
جستجو میں ہیں کہ دیں کیا مرے قاتل تجھ کو
حسن مستور ہویدا تھا ہویدا ہی رہا
کویی پردہ ہی نہ راس آیا نہ محمل تجھ کو
کبھی ٹھٹھ کے کبھی بے خوف وخطر کود پڑے
کبھی دریا تجھے سمجھا کبھی ساحل تجھ کو
اے خوشا،تو کہ ترا عکس جمالی خوش است
رکھ کے دیکھیں گے کبھی دل کے مقابل تجھ کو
کم نہ تھا زہر تمنا پیے تسکیں فرحت
ہم نے ناحق ہی پلایا سم قاتل تجھ کو

ورق ورق ہے ہر اک داستاں سبق آموز
میں زندگی ہوں مجھے وقت کے نصاب میں رکھ
نہ رنگ و بو کے لئے مجھکو بام و در پہ سجا
میں خشک پھول ہویی مجھکو اب کتاب میں رکھ
کبھی تو مجھکو بھی مخمور ہو کے جینے دے
زرا سی تندی و تیزی مری شراب میں رکھ
میں اپنے نفس کی سرحد پہ ہوچکی تحلیل
اب آفتاب میں رکھ یا مجھے حباب میں رکھ
بروز حشر مری بے بضاعتی مت بھول
یہ نا رسائی کا پہلو بھی تو حساب میں رکھ
مرے سوال کو بننے دے بازگشت اپنی
مگر کبھی تو صدا کچھ میرے جواب میں رکھ
مری نگاہ میں رہ صبح آرزو کی طرح
شب الم کی طرح مجھکو چشم خواب میں رکھ
کبھی کبھی کویی منظر حسیں پیے فرحت
حقیقتاً جو میسر نہیں تو خواب میں

Farhat Nadir Rizvi
M114,Abul Fazal Enclave
Part-1,Thokar No-5
Jamia Nagar
New Delhi-110025

قدسیہ انجم

سب کی آنکھیں گروی ہیں اس نگری میں

آج ندا کو اس کے تعلیمی اور سماجی کاموں کی وجہ سے سرکار نے لکھنؤ میں گورنر ایوارڈ سے نوازا۔ یہ ایوارڈ ہر سال ثانوی تعلیم میں یوپی بورڈ کے اسکولوں میں پڑھانے والے آٹھ اساتذہ کو ملتا ہے۔ اتر پردیش کے پچھتّر ضلعوں پر مشتمل ایک بڑا صوبہ ہے۔ جس کے ہر ضلع میں بہت سارے شہر اور قصبے ہیں۔ ہر ضلع سے کئی شہروں، قصبوں کے کئی انٹر کالج سے اگر 20-25 اساتذہ اپلائی کریں تو ایوارڈ لینا ناممکن تو نہیں مگر بہت زیادہ مشکل ہے۔ لیکچرار بننا آسان نہیں تھا۔ جب اس نے اپلائی کیا اس وقت بہت سارے امیدوار میدان میں تھے۔ میرٹ پر اس کا سلیکشن ہو گیا۔ پھر پرنسپل شپ کے لیے، سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ میں اپلائی کیا جو آل یوپی ہوتا ہے۔ اُس میں میرٹ پر سلیکشن ہو گیا۔ پھر قومی رصوبائی ٹیچر ایوارڈ کے لیے اپلائی کیا۔ سیکنڈری ایجوکیشن میں کوئی ٹیچر یا پرنسپل جب راشٹر پتی یا راجیہ پال ایوارڈ کے لیے اپلائی کرتا ہے تو سرکاری پرفورما جس میں بہت سارے پوائنٹس ہوتے ہیں انھیں ڈاکیومینٹس کے ساتھ بھرنا ہوتا ہے۔ ٹیچر کا رِزلٹ کتنے پرسنٹ ہے، کتنے اِسٹوڈینٹس کو پڑھایا، کتنے گھنٹے پڑھایا، کمزور بچّوں کے لیے کیا کیا، سماج کو کس طرح اثر انداز کیا، سماج میں بیداری لانے اور سماج کی بھلائی کے لیے کیا کام کئے۔ چار سیٹ کی فائل بن کر ڈی-آئی-او-ایس کے یہاں جمع ہوتی ہے۔ ضلع لیول پر ڈی-آئی-او-ایس کے یہاں ایک تین ممبر کی کمیٹی فائلوں کی جانچ کر کے سفارشات کے ساتھ پریاگ راج اور لکھنؤ بھیجتی ہے۔ اس کے بعد سرکاری سطح پر پورے اُتر پردیش کے کئی سو ٹیچرس کی فائل کو اکسپرٹ کے ذریعہ پرکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد جون میں انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے۔ انٹرویو اور فائل کے الگ الگ نمبر ہوتے ہیں۔ انٹرویو میں ایکسپرٹ بیٹھتے ہیں۔ جس میں سبجیکٹ سے متعلق سوال اور جی کے وغیرہ کے سوال پوچھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جن آٹھ ٹیچرس کا انتخاب ہوتا ہے انھیں پانچ ستمبر ٹیچرس ڈے پر یہ ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ سرکار کی بک لیٹ میں ہر ٹیچر کی تفصیلات ہوتی ہیں کہ یہ ایوارڈ کیوں دیا گیا۔

ندا نے زندگی میں بہت جدوجہد کی۔ ندا نے بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تربیت، تعلیم کی اہمیت اور ان کی سماج کے لیے ذمّہ داری اور سمجھ بنانے پر بھی محنت کی۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بچّے ڈگری تو لے لیتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں جب وہ داخل ہوتے ہیں تو انھیں بہت

دِقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اُن چیلینجس کا مقابلہ وہ کیسے کریں گے یہ بھی وقتاً فوقتاً بتاتی رہتی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات میں بھی لگائے رکھا۔ اس نے دیکھا کہ مردانہ سماج میں لڑکیوں، عورتوں کو دوئم درجہ کا مانا جاتا ہے اور اُن میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ اکثر لڑکیاں روتے ہوئے اس کے پاس آتیں جو ابھی آٹھویں، نویں میں پڑھ رہی ہوتیں، کہ ہماری شادی کی جا رہی ہے۔ ہم پڑھنا چاہتے ہیں، یا ہم آگے پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتے کیونکہ ماں باپ فیس نہیں دے پائیں گے، یا کسی لڑکے نے سڑک پر چھیڑ دیا تو اس کی سزا بھی لڑکی کو ملی۔ اس کا پڑھنا، لکھنا چھڑا کر گھر بیٹھا لیا گیا۔ اسنے ٹھان لیا کہ لڑکیوں کے ساتھ جو نا انصافی اور نا برابری کا سلوک ہوتا ہے چاہے وہ تعلیم میں ہو، صحت میں ہو، گھریلو تشدد میں ہو سب مدوں پر وہ اُن لڑکیوں کے لیے آواز اُٹھائے گی۔ جن لڑکیوں کی تعلیم غریبی کی وجہ سے چھوٹ گئی ہے ان کی فیس دے کر انھیں دوبارہ تعلیم سے جوڑا۔ کم عمر میں شادیوں کے لیے، ماں باپ کی کونسلنگ کی وہ لڑکے اور لڑکی کی تعلیم میں یکساں دلچسپی لیں۔ گھریلو تشدد کے بہت سارے معاملے فیملی کونسلنگ سینٹر اور اپنے لیول سے حل کیے۔ اس کے کام کو ایس ایس پی نے فیملی کونسلنگ سینٹر میں کونسلر متعین کیا جس میں اس نے والینٹری ورک کیا۔ جب آپ کام کرتے ہیں تو آپ کی ایک پہچان بننی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے آپ کو اپنے وقت، پیسے دونوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات انجام دیتی رہی۔ عورتوں اور لڑکیوں کو ایک پلیٹ فارم مہیّا کرانے کے لیے اس نے ایک تنظیم بنائی۔ اس کے لیے اس کے کچھ ساتھیوں نے مدد کی ندا نے زندگی میں بہت جدّ و جہد کی اور لڑائیاں لڑیں۔

جیسے ہی ایوارڈ کی لسٹ لکھنؤ سے رامپور ڈی-آئی-او-ایس آفس پہنچی مبارک باد کے لیے فون کی گھنٹی گھن گھنانے لگی۔ اسی شہر کے کئی ٹیچرس اور پرنسپل نے ایوارڈ کے لیے اپلائی کیا تھا مگر سلیکشن ندا کا ہوا۔ جہاں خوش ہو کر لوگ مبارک باد دے رہے تھے وہیں مردانہ سماج کی سوچ عورت کے لیے ہمیشہ ایک ہی نظر رکھتی ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کی ساری محنت، پڑھائی، لکھائی، ڈگریاں، سماجی خدمات، لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کو جدوجہد اِن مردوں کی چھوٹی سوچ کے آگے تو سب مٹی ہے۔ اگر مرد زندگی میں کچھ حاصل کرے تو اس نے اپنی لگن، محنت، ذہانت اور قابلیت سے حاصل کیا ہے اور اگر عورت نے کوئی مقام اپنی محنت سے حاصل کیا ہے تو اسنے سمجھوتے کیے ہوں گے۔ واہ رے مردانہ سماج! تم کبھی عورت کو عزّت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ تمھاری نظر میں عورت نہ محنت سے کچھ حاصل کر

”جیسے ہی ایوارڈ کی لسٹ لکھنؤ سے رامپور ڈی-آئی-او-ایس آفس پہنچی مبارک باد کے لیے فون کی گھنٹی گھن گھنانے لگی۔ اسی شہر کے کئی ٹیچرس اور پرنسپل نے ایوارڈ کے لیے اپلائی کیا تھا مگر سلیکشن ندا کا ہوا۔ جہاں خوش ہو کر لوگ مبارک باد دے رہے تھے وہیں مردانہ سماج کی سوچ عورت کے لیے ہمیشہ ایک ہی نظر رکھتی ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کی ساری محنت، پڑھائی، لکھائی، ڈگریاں، سماجی خدمات، لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کو جدوجہد اِن مردوں کی چھوٹی سوچ کے آگے تو سب مٹی ہے۔“

سکتی ہے نہ اس کے پاس ذہانت ہے اور نہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کچھ پا سکے۔ بس ساری عقل اور ذہانت خدا نے ان مردوں کو ہی دی ہے۔ ندا سوچنے لگی کہ اگر یہ مرد واقعی پڑھے لکھے اور کشادہ ذہن کے ہوتے تو انھیں پتہ ہوتا کہ مقابلہ جاتی امتحان کیا ہوتا ہے، یہ کیسے کمپلیٹ کیا جاتا ہے کتنی جدوجہد کے بعد یہ مقام حاصل کیا جاتا ہے۔

اب مردانہ سماج کی سوچ دیکھیں کہ اپنی ندا کا کام اس کی محنت قابلیت نظر نہیں آئی نظر آئی تو صرف عورت ہونا۔ اور اِس پدرانہ اور مردانہ سماج میں عورت ہونا گناہ ہے۔ مرد کی کامیابی کا سہرا مرد کو ہی دیا جاتا ہے مگر عورت کی کامیابی کا سہرا یہ مردانہ سماج اس کی صلاحیتوں کو کبھی نہیں دیتا۔ عورت جب اپنی کاوشوں اور جدّ و جہد سے آگے بڑھتی ہے اور اپنی محنت سے کچھ حاصل کرتی ہے تو مرد کہتے ہیں ”سمجھوتے سے آگے بڑھی ہے“

کون بدن سے آگے دیکھے عورت کو
سبکی آنکھیں گروی ہیں اس نگری میں

□□□

Qudsia Anjum
70/11, Pakka Bagh
Saharanpur (U.P)
9837378699/8218902778

پیار کیا ہے تم ہی سے......!

خیرالنساء علیم

اس روز حمزہ کو آفس کے بجائے سائیٹ پر جانا تھا......اس لیے اطمینان سے ناشتہ کے بعد اخبار لے کر بیٹھ گیا، تب ہی نیلوفر آ کر کہنے لگی:

''حمزہ! مجھے کالج ڈراپ کر دیں۔''

''کیوں گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟''

''جی نہیں! کسی کے ساتھ نہیں......صرف آپ کے ساتھ ہی جانا ہے......''

''اوہو! کس خوشی میں......؟ آج سورج مغرب سے تو نہیں نکلا؟''

''زیادہ باتیں نہ کریں......، آج میں نشاط سے آپ کو ملوانا چاہتی ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''جب سے اس کو معلوم ہوا ہے کہ آپ ماڈلنگ کرتے ہیں...... اس لیے......''

''نہیں میں کسی سے نہیں ملوں گا......، میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے......''

''میں سب کی نہیں صرف نشاط کی بات کر رہی ہوں......۔''

''نشاط ہو یا ٹشاط ہو...... مجھے کسی کو دیکھنے یا ملنے کا شوق نہیں! جانتی ہو کیوں؟''

''کیوں؟'' وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیوں کہ وہ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوگی...... ہو ہی نہیں سکتی......''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟...... آپ نے تو اُسے دیکھا ہی نہیں......''

''اور دیکھنا بھی نہیں چاہتا ...... پتا ہے کیوں......؟'' اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہ کہ کیوں؟" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کہ ...... میں تمھیں...... بس تمھیں ہی دیکھنا چاہتا ہوں......نیلو!"

وہ ایک جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا......اور وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

"اتنی محبت ہے نیلو تم سے کہ نہ میں بتا سکتا ہوں اور نہ ہی تم سوچ سکتی ہو......آج سے پہلے بھی میں تم سے یہ سب کہتا رہا ہوں، لیکن تم میری باتوں کو ہوا میں اُڑا دیتی ہو......تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے دل لگی کر رہا ہوں......محبت ہے مجھے تم سے......چاہتا ہوں میں تمھیں......اسی لیے میں نے بڑی اماں سے شادی کی بات بھی کی تھی۔"

"تم کب سمجھو گی......؟ کس طریقہ سے سمجھاؤں تمھیں؟" کہتے ہوئے وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"بولو نا! کب سمجھو گی تم؟"

"اچھا......اچھا......حمزہ! سب سنوں گی بھی اور سمجھوں گی بھی......بس آج آپ نشاط سے مل لیں......پلیز!" وہ خوشامدانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"افوہ! پھر وہی نشاط! نشاط!......کیا ہو گیا ہے نیلو؟ تم ہر وقت اُسے ہی سوچتی رہتی ہو؟ جب بات کرو وہیں نشاط کا کلمہ تمھاری زبان پر......! یا اللہ!......تم مجھے پاگل کر دو گی!!"

"نہیں! آپ خوش ہو جائیں گے حمزہ! وہ کہتی ہے آپ بہت خوبصورت ہیں...... بہت ہینڈسم ہیں...... آپ کے آگے تو میں کچھ بھی نہیں......اتنا آئیڈیل قد ہے آپ کا......جبکہ میں تو آپ کے کندھے سے بھی دو ایک انچ نیچے ہوں، پھر بھی آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں......بعد کو آپ پچھتائیں گے......مجھ جیسی کم قد کی لڑکی کے ساتھ آتے جاتے آپ کو بہت بُرا لگے گا......آپ کو پتا ہے نشاط نے اور کیا کہا......؟ اس جیسی پانچ فٹ ۱۰ انچ والی لڑکی سے شادی آپ کے لیے زندگی بھر کی خوشیوں کا باعث ہو گی......"

"بس! اب ایک لفظ اور نہیں) کتنا عرصہ ہوا نشاط سے دوستی کو......؟"

"ایک سال ہونے والا ہے......مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اور تم میرے ساتھ کب سے رہ رہی ہو؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے......ہم بچپن سے ساتھ رہے ہیں؛ بلکہ ایک ہی گھر میں ساتھ ساتھ بڑے ہوئے ہیں......"

"تو پھر مجھے تم بتاؤ! کہ تم مجھے زیادہ جانتی ہو یا نشاط کو؟"

"ظاہر ہے آپ کو!"

"نہیں! تم نے مجھے نہیں جانا نیلوفر! اگر جانا ہوتا تو نشاط کی بے تکی باتوں پر یوں یقین نہ کرتیں...... جھوٹ کہتی ہے وہ لڑکی......تم بہت خوبصورت ہو نیلوفر! بہت خوبصورت......تمھاری خوبصورتی و معصومیت پر باقاعدہ شاعری کر سکتا ہوں میں......اپنے جذبوں کا احساس دلا سکتا ہوں میں، مگر کب؟ جب تم میری زندگی میں آؤ گی......میری منکوحہ بن کر......میری شریک حیات بن کر......تب جانو گی کہ مجھے تم سے کیسی اور کتنی محبت ہے۔"

وہ خاموش ہو کر اُسے دیکھنے لگا...... جو گم سم سی بیٹھی اُسے ہی تک رہی تھی، پھر حمزہ خود ہی کہنے لگا:

"میں تو تم سے یہ بھی نہیں کہنا چاہتا نیلو! کہ مجھے تم سے محبت ہے......بس بڑی اماں کے سامنے بات رکھ دی تھی کہ مجھے تم سے شادی کرنی ہے......سب بخوشی راضی تھے......اگر تم بھی اپنی رضامندی ظاہر کرتیں تو یہ سب کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی......اسی دن اپنے سارے جذبے اپنے سارے احساسات تمھیں سونپتا جب تم میرے نکاح میں آتیں، اور ہم مل کر عہد کرتے کہ ہم تمام عمر ایک دوسرے کے دُکھ سکھ بانٹیں گے...... ایک دوسرے سے وفاداری نبھائیں گے...... میں بالکل جائز طریقہ سے، تمھاری مرضی سے تمھیں اپنی زندگی میں شامل کرتا......آج بھی میں تم سے یہ سب نہیں کہتا، مگر کہہ گیا، کیوں کہ اب یہ امید کمزور ہوتی جا رہی ہے......میں یہ کبھی نہیں کہوں گا نیلو کہ......میرے جذبے قبول کرو...... مجھے سوچو! مجھے چاہو!......نہیں......کبھی نہیں نیلو! یہ دلوں کے ناتے سوچ سمجھ کر تو نہیں جوڑے جاتے، یہ تو بس اپنے آپ جُڑتے چلے جاتے ہیں......کم از کم میں نے تو ایسے ہی محسوس کیا ہے...... میں نہیں جانتا کہ تمھاری کس خوبی سے متاثر ہو کر میں نے تمھیں چاہا...... اور تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا......اگر تم انکار کرو گی تو بھی میں تمھیں الزام نہیں دوں گا...... کیونکہ تمھاری مرضی اور خوشی میری نظر میں بہت معنیٰ رکھتی ہے......" اپنی بات ختم کر کے اس نے اطمینان سے نیلوفر کی طرف دیکھا، وہ ہنوز خاموش بیٹھی تھی، اس نے ایک طویل سانس لی اور کار اسٹارٹ کر کے کالج کے رستے پر ڈال دیا......کالج کے گیٹ پر کار روکی تو اس کے اترنے سے پہلے کہنے لگا:

"سنو! نشاط، نشاط سے نہیں ملواؤ گی......؟" وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

''جی ہاں! کیوں نہیں، سامنے آتی گرین سوٹ والی لڑکی نشاط ہی تو ہے، دیکھا آپ نے کتنی خوبصورت ہے نا وہ......'' وہ اُسے گھور کر اپنا بیگ سنبھالتی ہوئی اتر گئی اور وہ ''اوہ گاڈ'' کہتا ہوا جلدی سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

بڑے ابا اور بڑی اماں کو گھر کے سربراہ کی اہمیت وحیثیت حاصل تھی، گو کہ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی؛ مگر دونوں نے تینوں چھوٹے بھائیوں کی اولادوں کو اپنے دامنِ محبت میں سمیٹ رکھا تھا، ابو اور بڑے چچا کے چار، چار بیٹے تھے، جبکہ چھوٹے چچا کی ایک ہی بیٹی تھی نیلوفر! آٹھ بیٹوں کے درمیان ایک بیٹی نے جنم لیا تھا؛ تو یوں اس کی اہمیت وحیثیت سب سے بڑھ کر تھی...... جب بڑے چچا کے بڑے بیٹے حمزہ نے نیلوفر کے لیے اپنے پیار کے انداز کو بدلتا محسوس کیا تو پہلے خود سے پھر بڑی اماں کے پاس بیٹھ کر اعتراف کر لیا کہ......

''بڑی اماں! میں نہیں جانتا کہ یہ کیوں ہوا؟ میں نے خود کو بہت سمجھایا بھی مگر دل نہیں مانا......بس نیلو کو بہن نہیں مان سکتا......، یوں بھی وہ سگی بہن نہیں ہے میری، بڑی امّاں! میں شادی اسی سے کروں گا...... میں نے سوچ رکھا ہے، بس!!''

''اچھا بیٹا! یہ تم مجھے اپنا حالِ دل سنا رہے ہو یا فیصلہ؟'' بڑی اماں مسکراہٹ چھپا کر پوچھنے لگیں......۔

''آپ جو بھی سمجھیں بڑی اماں! مگر یہ طے ہے اس کے علاوہ کوئی اور میری زندگی میں نہیں آئے گی......۔''

یوں بڑی اماں کو کہہ کر وہ بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا......، بڑی اماں بھی بہت خوش تھیں کہ گھر کی بچی گھر میں ہی رہے گی۔

تب انھوں نے حمزہ کا معاملہ بڑے ابا سمیت تینوں دیوروں کے درمیان رکھ دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ:

''میں نہیں سمجھتی کہ اس میں کوئی حرج ہے......آپ سب کیا کہتے ہیں؟''

''ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے بھابی ماں!...... بلکہ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری بیٹی ہماری نظروں کے سامنے ہی رہے گی......۔'' چھوٹے چچا چچی نے جو نیلوفر کے والدین تھے اپنی رضامندی دے دی......۔

یوں سب کی رضامندی مل گئی تو حمزہ بہت خوش تھا...... ناخوش تھی تو بس وہی جس کا تعلق تھا......۔

بوکھلا کر نیلوفر سب سے پہلے بڑی اماں کے کمرے میں بھاگی۔

''بڑی اماں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حمزہ میرے بھائی ہیں......''

''سگا بھائی نہیں ہے۔'' بڑی اماں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں! سگا تو نہیں ہے مگر میں سمجھتی ہوں۔'' وہ برا سا منہ بنا کر کہنے لگی۔

''سمجھنے کے لیے باقی سات ہیں......۔'' بڑی اماں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور خود سے نزدیک کر لیا۔

''آپ بھی بس ایسی ہی ہیں بڑی اماں!......کوئی ساتھ نہیں دیتا میرا......۔''

وہ بڑے ابا کے پاس......امی ابا کے پاس، سب کے پاس اپنی فریاد لے کر پہنچی؛ لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہوا، سب نے اُسے ہی سمجھایا۔

اس شام نیلوفر سب سے الگ تھلگ ٹی وی آن کیے مختلف چینل بدلتے ہوئے بیزارگی کے عالم میں بیٹھی تھی کہ یکایک بڑے ابا کو پکارا تھا......:

''او مائی گاڈ! بڑے ابا ٹی وی دیکھیے تو......!'' سب ہی چونک کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے......ٹی وی پر مشہور فیبرکس کا اشتہار دکھایا جا رہا تھا......اور ماڈل جو نظر آ رہا تھا وہ یقیناً حمزہ ہی تھا۔

بڑے ابا نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگے:

برخوردار! ان چھوٹے چھوٹے اشتہارات ہی تک سوچنا......آگے پیر پھیلانے کی کوشش نہ کرنا......سمجھے!''

جی بڑے ابا......! یہ میں نے ناصر عباس کے مجبور کرنے پر کیا ہے......میں جانتا ہوں آپ کے خیالات کو! سو اس لیے چند ایک اشتہار سے آگے نہ بڑھوں گا......!'' اس نے سعادت مندی سے کہہ کر بڑے ابا کے آگے ہلکا سا سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے دن کالج جاتے ہوئے وہ پھر بضد تھی کہ نشاط سے ملیں۔

''نشاط سے ملنے میں آپ کو کیا تکلیف ہے حمزہ؟''

''بس! اب اور نہیں نشاط نامہ میرے سامنے......سمجھیں......!''

''میری کوئی بات نہ مانیں آپ......'' کہتے ہوئے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گیٹ پار کر گئی......۔

اس دن جیسے ہی وہ کامن روم میں داخل ہوئی؛ بڑی تیزی سے آتی نشاط اس سے لپٹ گئی......۔

''تھینک یو! نیلوفر......تم نے مجھے بہت خوش کر دیا ہے......۔''

''ہوا کیا نشاط......؟ کچھ تو بتاؤ؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کتنی اچھی اور پیاری ہو تم نیلوفر! مجھے حمزہ سے ملوا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے......کل ہی انھوں نے مجھے ناصر عباس سے تعارف کروایا

ہے، میں بہت خوش ہوں نیلوفر......! ماڈلنگ میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی ہے...... تھینکس اے لاٹ......" کہتی ہوئی وہ کامن روم کے باہر چلی گئی......اور نیلوفر بت بنی خلاؤں میں دیکھتی رہ گئی......۔

جیسے ہی وہ گھر پہنچی سیدھا حمزہ کے کمرے میں چلی گئی......اور وہ ٹیبل پر کاغذات پھیلائے اپنے پروجیکٹ کو چیک کر رہا تھا۔

"نشاط سے ملنے کا کہتی تو کیسا مجھے کاٹنے کو دوڑتے تھے......اور اب تو بڑی ملاقاتیں ہو رہی ہیں...... میں چھوڑوں گی نہیں آپ کو، سمجھے آپ......!"

"سمجھ گئے...... بہت اچھی طرح سمجھ گئے نیلو! تمھاری ہی تو خواہش پوری کی ہے میں نے...... میں تو سمجھ رہا تھا تم بہت خوش ہوگی......۔"

"خوش؟...... مائی فُٹ!! مجھے آپ بتائیے کہ آپ اس سے ملے ہی کیوں؟......اور وہ بھی مجھے بتائے بغیر......؟ نشاط نہ کہتی تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا...... مجھے بتائے بغیر کیوں ملے اس سے......؟"

"نیلوفر! آہستہ بولو!......مرواؤ گی کیا؟" وہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکا......محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا:

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ اُس نشاط ٹشا دسے ملوں......اب غصہ کیوں ہوتی ہے؟ تمھیں تو خوش ہونا چاہئے، تمھاری خواہش پوری کردی میں نے......قسم سے کیا لڑکی ہے......! لاجواب! خوبصورت ترین، میری تو نظر ہی ہٹ نہ رہی تھی......۔" وہ آنکھیں میچ کر شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"ہاں ہاں! مرجائیں اُسی پر...... میں کون ہوتی ہوں۔" وہ بے قابو ہو کر رونے لگی۔

"چاہتی ہو ناں...... مجھے بہت؟" اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا......، اس نے اپنی ہونٹ سکوڑ کر "ہاں" میں سر ہلا دیا۔

"پھر اتنی بدگمانی کیوں؟ مجھ پر اعتبار بھی کرو......! میں تمہارا ہی ہوں سدا سے اور رہوں گا سدا ہی......"

"ہاں تو کیوں ملے اس سے......؟ ملے تو ملے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"میں اس لڑکی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا...... وہ چالاک لڑکی تمھارے ذہن میں یہ بات ڈالنے میں کامیاب ہوگئی تھی کہ تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں ہے......اور تم نے بھی تو بے وقوفی کی حد کردی......اس کی باتوں پر ایمان لے آئیں......۔"

"اب اتنی بھی بیوقوف نہیں ہوں میں!" اس نے پلکوں کی جھالر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ نشاط کی باتیں بھول گئیں......؟ تم نے ہی تو کہا تھا نا کہ میں آپ کے ساتھ سوٹ نہیں کرتی......" اس نے ہنستے ہوئے اس کی نقل اُتاری۔

"ایسی باتیں سن سن کر تم مجھ سے دور نہیں ہو جاتیں......اور میں حسرت و یاس میں کنوارا ہی مرجاتا......، درست کہہ رہا ہوں نا......!"

"ہاں! جیسے میں تمھیں مرنے دیتی ناں......!" پہلی بار وہ دل سے مسکرائی تھی، اور وہ تیزی سے دروازے سے باہر بھاگی تھی......۔"

"ارے! ارے! رُکو تو نیلو!......" وہ بھی پیچھے دوڑا......لیکن دروازہ کھلتے ہی پورے کزنز کی پارٹی وکٹری کا نشان بنائے کھڑی تھی۔

"حمزہ! اپنا بچپن کب چھوڑو گے...... کب تک لڑ لڑ کر اعتراف کرتے رہو گے؟"

"کیا مطلب؟ آپ کو کس نے بتایا کہ ہم لڑ رہے ہیں؟" وہ اپنی جگہ سے اچھلا۔

"آپ سب بڑے بھائی ہیں ہمارے، چھپ چھپ کر ہماری باتیں سن رہے ہیں......نہ صرف سن رہے ہیں بلکہ اشتہارِ عام کی طرح ایک دوسرے کو سنا بھی رہے ہیں، یہی نہ ہوسکا کہ ہم لوگوں کو کچھ اچھے مشورے ہی دے سکتے......!!"

سب کے سب قہقہے لگاتے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے جب باہر نکلے تو دیکھا کہ بڑی اماں ہال میں دیوان پر لیٹنے والے انداز میں بیٹھی اطمینان سے مسکرا رہی تھیں......، اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ پروردگار نے ان کی سن لی تھی...... کہ ان کی لاڈلی نیلوفر کو اب تمام عمر اسی گھر میں ان کی نظروں کے سامنے ہی رہنا تھا......، حمزہ اور ان سب کی محبتوں کے سایہ میں......۔

□□□

Khairunnisa Aleem
H.No: 16-2-141/B
Flat No: 301,
Near Officers Mess
Malakpet
Hyderabad-500036 (T.S.)
9866613643

لذیذ پکوان

ارم نعیم

آم کی قتلیوں کی میٹھی چٹنی

گرمیوں کا موسم اپنے شباب پر ہو اور پھلوں کے راجا جناب آم کا ذکر نہ ہو یہ بھلا کس طرح ممکن ہے۔ آم اپنے نام سے بھلے ہی عام ہو مگر پھلوں کے دریچے میں سب سے اعلیٰ منصب پر فائز ہیں، آم کے ذائقے، شہرت و دلکشی کا تو یہ عالم ہے کہ مرزا غالب بھی اس کی مدح کیے بغیر نہ رہ سکیں، دیوانِ غالب میں آم پر ایک مختصر مثنوی ہے جس میں غالب فرماتے ہیں کہ

مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

تو لیجیے جناب آج ہم آپ کی خدمت میں آم کا ایک نیا ذائقہ لے کر حاضر ہوئے ہیں، اگر آپ نے ابھی تک اسے نہیں کھایا تو آپ ایک دیسی ذائقے سے محروم ہیں، آیئے اسے بنانا شروع کرتے ہیں، اس کے لیے ہمیں چاہیے

اجزا: 500 گرام کچے آم، 200 گرام شکر یا گڑ، آدھا چمچ دیسی گھی یا ریفائنڈ، 6 کپ پانی، 4 عدد لونگ، آدھا چمچ کلونجی دانے، آدھا چمچ نمک، آدھا چمچ سونف پاؤڈر، آدھا چمچ دھنیا پاؤڈر، آدھا چمچ زیرا پاؤڈر، آدھا چمچ کلونجی پاؤڈر، آدھا چمچ میتھی دانہ پاؤڈر، آدھا چمچ کُٹی ہوئی لال مرچ

ترکیب: سب سے پہلے آم کو چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں، اب ایک ہانڈی یا پین میں 4 کپ پانی اُبلنے کے لیے رکھ دیں پانی میں اُبال آنے پر آم کی کٹی ہوئی قتلیاں ڈال کر 5 منٹ تک مدھم آنچ پر اُبلنے دیں، اب قتلیوں کو پانی سے باہر نکال کر کسی کاٹن کپڑے پر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

اسی درمیان دھیمی آنچ پر ایک پین رکھے اور اس میں گھی ڈالیں، گھی گرم ہونے پر لونگ اور کلونجی دانے ڈال کر اس میں آم کی قتلیاں ملائیں، اب اس میں تین کپ پانی، شکر، نمک، کُٹی ہوئی مرچ، دھنیا، میتھی، زیرا، کلونجی اور سونف کا پاؤڈر ڈال کر ڈھک دیں اور 10 منٹ شیرا گاڑھا ہونے تک پکنے دیں، بیچ میں ایک دو دفعہ چمچے کی مدد سے ملا بھی دیں، جب شیرے میں اُبال آجائے اور پہلے سے گاڑھا نظر آنے لگے تو بس قتلیوں کی میٹھی چٹنی بن کر تیار ہے، آپ اسے ٹھنڈا یا گرم دونوں طرح روٹی، پوری، پراٹھے کے ساتھ یا پھریوں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

نوٹ: آپ اس چٹنی کو بآسانی 5 دنوں تک فریج میں اسٹور کر استعمال کر سکتے ہیں لیکن اسے شیشے یا پلاسٹک کے کھلے ہوئے برتن میں رکھیں۔ شکر کی مقدار حسبِ ذائقہ رکھ سکتے ہیں۔

چنے دال کے پراٹھے

ذائقے کے دیوانوں نے آج تک پراٹھے تو ہر طرح کے کھائے ہوں گے مثلاً آلو، گوبھی، مولی، پنیر وغیرہ، مگر کیا آپ نے چنے دال کے پراٹھے کھائے ہیں؟ اگر نہیں تو اب ان کا لطف ضرور لیجیے، یہ بھی گرمیوں میں اور خصوصی طور پر آم کے سیزن میں بنائے جاتے ہیں، ان کا استعمال، قیمے سے یا پھر رسیلے آم یا آم کی قتلیوں کی میٹھی چٹنی سے کیا جاتا ہے، گھر کے بزرگ اسے دل بھری پوری بھی کہتے ہیں، تو آیئے دیکھتے ہیں اسے بنانے کے لیے ہمیں کن چیزوں کی ضرورت ہوگی.....

اجزا: 250 گرام چنے کی دال، 500 گرام آٹا، آدھا چمچ میدا (OPTIONAL)، چوتھائی چمچ نمک، 3 لال سوکھی مرچ، 1 چھوٹا چمچ ہلدی

پاؤڈر، آدھا چمچ لہسن پیسٹ، آدھا چمچ ادرک پیسٹ، 4 کپ پانی، 4 بڑے چمچے گھی یا ریفائنڈ، آدھا چمچ زیرا پاؤڈر، آدھا چمچ اجوائن دانے

ترکیب: ایک کوکر میں دُھلی ہوئی دال، پانی، سوکھی لال مرچ، ہلدی پاؤڈر، ادرک لہسن کا پیسٹ اور نمک ڈال کر ڈھکن لگا دیں، اور دھیمی آنچ پر 2-3 سیٹیاں آنے تک پکائیں تا کہ دال اچھی طرح گل جائے۔

اسی درمیان پراٹھے کے لیے ایک برتن میں آٹا، میدا، چٹکی بھر نمک، 1 بڑا چمچ گھی، اجوائن ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور اب تھوڑا تھوڑا پانی ڈالتے ہوئے گوندھ لیں، آٹا نہ تو روٹیوں جیسا نرم ہو اور نہ ہی پوریوں جیسا سخت بلکہ درمیانی ہو۔

اب کوکر میں سیٹیاں آ چکی ہوں تو اسے کھول کر یہ دیکھ لیں کہ دال اچھی طرح نرم ہوئی ہے یا نہیں (اگر نہ ہوئی ہو تو تھوڑا سا پانی ڈال کر ایک سے دو سیٹی آنے تک مزید پکائیں) دال کو کسی گرینڈر میں ڈال کر اچھی طرح ایک سوکھا سا پیسٹ تیار کر لیں اور دال پیستے وقت اس میں پانی بالکل نہ ڈالیں، اب دال کے پیسٹ کو کسی برتن میں نکال کر اس میں زیرا پاؤڈر ملائیں۔

پراٹھوں کے لیے توا گرم ہونے کے لیے رکھ دیں اور آٹے سے روٹیوں کے سائز کے پیڑے کاٹ لیں اب درمیان میں دال کی اسٹفنگ کریں ٹھیک ویسے ہی جیسے آلو وغیرہ کے پراٹھے میں کرتے ہیں، بیلنے کے بعد پراٹھے کو دونوں طرف سے گھی لگا کر لائٹ براؤن ہونے تک سینک لیں، یہ لیجیے گرما گرم چنے دال کے پراٹھے تیار ہیں۔

نوٹ: اگر دال کا پیسٹ بچ جائے تو آپ اسے ایئر ٹائٹ ڈبے میں کر کے فریج میں رکھ لیں، اور دوبارہ سے پراٹھا بنانے میں استعمال کر لیں۔

چٹخارے دار آلو

گرمیوں کی شام ہو اور کچھ چٹخارے دار نہ کھایا تو گرمیوں کا لطف ہی کیا لیا، اور ہمیشہ اسنیکس کے لیے استعمال ہونے والے آلو ایک انوٹھے ذائقے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہے، اسے بنانے کے لیے ہمیں چاہیے:

اجزا: 500 گرام آلو، 100 گرام دھنیا، 100 گرام پودینہ، 8-10 ہری مرچ، 50 گرام املی، 1 چمچ نمک، ایک چوتھائی پانی، ایک چوتھائی کالا نمک، الیموں، ایک چوتھائی از زیرا پاؤڈر

ترکیب: سب سے پہلے املی اچھی طرح صاف کر کے آدھے گھنٹے تک پانی میں بھگو کر رکھ دیں، اب پریشر کوکر میں 2 سے 3 سیٹیاں آنے تک اُبال لیں، جب آلو اُبل چکے ہوں تو اسے ایک برتن میں اپنے من پسند شیپ میں کاٹ لیں۔

اب املی اگر بھیگ کر بڑی ہو چکی ہو تو املی کو بیج سے الگ کر کے اس کا مغز اور املی کا پانی، پودینہ، دھنیا، مرچ، نمک اور چوتھائی کپ پانی ڈال کر کسی گرینڈر کی مدد سے اچھی طرح پیس لیں، اب کٹے ہوئے آلو میں 2 سے 3 چمچے چٹنی (یا حسبِ ذائقہ) ڈال کر، کالا نمک، لیموں کا رس اور زیرا پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح ملا لیں، یہ لیجیے چٹخارے آلو کے مزیدار کچالو جھٹ پٹ بن کر تیار ہیں۔

نوٹ: بچی ہوئی چٹنی ایئر ٹائٹ ڈبے میں رکھ کر فریز کر لیں آپ اسے 8 سے 10 دنوں تک پکوڑے یا کھچڑی کے ساتھ یا پھر دوبارہ کچالو بنانے میں استعمال کر سکتے ہیں، انشاءاللہ اس کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

□□□

Eram Naim
92/100 Shahnoor Ali Ganj
Prayagraj- 211003(U.P)

نظام بولی اور اس کے امراض

حسین فاروقی

نظام بولی کے تحت گردے/ حالب (Ureters) مثانہ اور Urethra آتے ہیں۔ گردے عمل استحالیہ میں پیدا ہوئے مضر اثرات مادوں کو خون سے الگ کرتے ہیں، جسم میں رقیق مادوں کا توازن برقرار رکھنے اور حیاتی کیمیاوی مادوں کا تناسب بنائے رکھنے کا اہم کام انجام دیتے ہیں۔ گردوں کے ذریعے پیشاب بنتا ہے۔ پیشاب گردوں سے حالب کے ذریعے مثانہ میں پہنچتا ہے اور وقتاً فوقتاً نزائیہ کی راہ جسم کے باہر نکلتا ہے۔ گردے کا وزن صحتمند آدمی میں تقریباً تین سو گرام ہوتا ہے۔ عورتوں کے گردے کا وزن مردوں کے گردے کے مقابلے میں تھوڑا کم ہوتا ہے۔

گردے کی اوپری سطح جو کہ شکم کو چاک کرنے پر نظروں کے سامنے ہے محدب (Convex) ہوتی ہے جب کہ پچھلی سطح چپٹی اور بیرونی کنارا محدب و اندرونی مقعر (Concave) ہوتا ہے۔ گردے کے اندرونی کنارے پر ناف کے مثل گڑھا ہوتا ہے جسے ناف گردہ کہتے ہیں۔ ناف گردہ کے متبادل لفظ انگریزی میں ہائلس (Hillus) ہوتا ہے۔ ہائلس کی راہ عروق اور اعصاب گردے میں داخل ہوتے ہیں اور حالب جو کہ ناف گردہ سے برآمد ہوتا ہے۔ نیچے کی جانب مثانہ سے جاملتا ہے۔ گردوں پر مضبوط جھلی کا بنا ہوا ایک غلاف بھی ہوتا ہے۔

گردوں کی خوردبینی ساخت: گردوں کو ناف گردہ کے مقام سے اگر لمبائی میں چیر کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اندرونی ساخت کا معائنہ کیا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ناف گردہ سے متصل اندر کی جانب جوف ہوتا ہے جو کہ حالب کے بالائی حصے کے مثل قیف کے پھیلنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہ قیف نما جوف لمبوترے پھول کے زیریں حصے سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور اس کا بالائی حصہ تقسیم ہو کر ننھے ننھے جوفوں کو جنم دیتا ہے جن پر گردوں کی مخروطی بلندیاں احرام گردہ (Pyramid of the Kidney) موجود ہوتے ہیں۔ احرام گردہ کی چوٹیاں جوف گردہ کی سمت ہوتی ہیں اور ان پر چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں جو کہ پیشاب بنانے کی اہل باریک باریک نلیوں کے دہانے ہوتے ہیں۔ مخروطی بلندیوں پر احرام مصر کی طرح لکیریں بھی ہوتی ہیں جو کہ پیشاب کی نلکیوں انابیب بولیہ کے نظم سے لگے ہونے سے وجود میں آتی ہیں۔ گردے کا یہ درمیانی حصہ جس میں احرام گردہ ہوتے ہیں سرخ زردی مائل ہوتا ہے اور اس کو گردے کا میدولا (Medulla) یا لب الکلیہ کہتے ہیں۔ میدولا کے اوپر موجود گردے کے محیطی حصہ کو گردے کا چھلکا یا قشرۃ الکلیہ (Cortex) کہتے ہیں۔ قشرۃ الکلیہ کا رنگ سرخی لیے ہوئے سیاہی مائل ہوتا ہے اور ساخت اس کی دانے دار ہوتی ہے۔ قشرۃ الکلیہ سے پیشاب کی باریک باریک نالیوں انابیب بولیہ کی ابتدا ہوتی ہے جو کہ احرام گردہ کی چوٹ میں ختم ہوتی ہے۔ احرام گردہ کے مابین قشرۃ الکلیہ کے خلیہ در آتے ہیں اور کلیتی ستون (Renal Column) کی شکل پیدا ہوتی ہے۔

انابیب بولیہ (Uriniferous Tubulies): انابیب بولیہ باریک ٹیوب کی مثل ہوتی ہیں اور ان کا ابتدائی سرا پیالہ نما ہوتا ہے۔ جسے

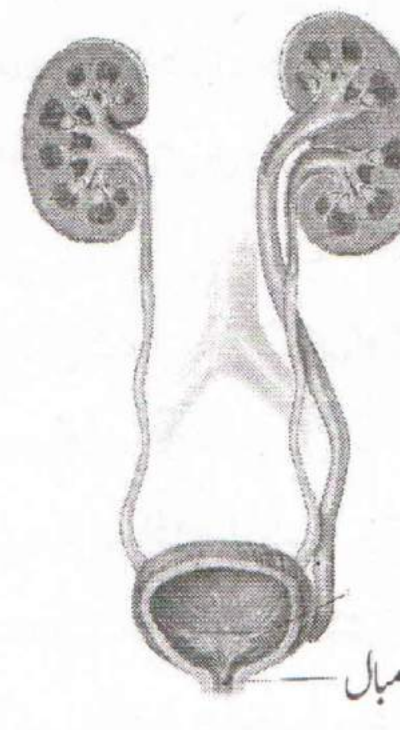

نظام بولیہ کے اعضا

باؤمین سائنسدان کے نام پر باؤمین کیسہ (Boumans Capsule) کہتے ہیں۔ باؤمین کیسہ حقیقت میں انابیب بولیہ کے ابتدائی سرے کے اندر کی جانب پلٹ آنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے اس کا اندازآپ کو بخوبی ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کسی گیند کو ایک جانب سے انگلی سے دبائیں تو گیند کی دیوار اندر کی جانب دھنستی چلی جاتی ہے اور پیالہ کی شکل نکل آتی ہے۔ باؤمین کیسہ کے زیریں حصہ سے انابیب بولیہ کی ابتدا ہوتی ہے جو کہ شروع میں گھومی ہوئی ہوتی ہے اور پھر سیدھی ہو کر انگریزی کے حرف U کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ انابیب کے اس حصہ کو انگریزی میں ہنلے لوپ (Henles Loop) کہتے ہیں۔ ہنلے لوپ کے اختتام پر انابیب بولیہ کے آخری حصہ (Digital End) کی ابتدا ہوتی ہے جو کہ شروع میں گھوما ہوا ہوتا ہے اور بعد ازاں یہ ٹیوب سیدھی ہو کر گردہ میں پھیلی ہوئی محرب نما نلکیوں سے رابطہ قائم کر لیتی ہے۔ یہ محراب نما نلکیاں گردے میں مختلف مقامات پر قطر میں موجود نالیوں میں مل جاتی ہے جو کہ آخر کار قیف نما جوف کے بالائی حصہ سے منسلک پیشاب کی نالی سے رابطہ قائم کر لیتی ہے۔

انابیب بولیہ جن کی تعداد گردوں میں لاکھوں میں ہوتی ہے ساخت میں عموماً ایک دوسرے سے یکسانیت رکھتی ہیں لیکن وہ اناب جن کی ابتدا قشرۃ الکلیہ کے اوپری حصے سے ہوتی ہے ان کے ہنلے لوپ قشرۃ الکلیہ کے اندرونی حصہ سے شروع ہونے والی اناہیپ کے ہنلے لوپ کے مقابلہ میں چھوٹے ہوتے ہیں۔

انابیب بولیہ کے باؤمین کیسہ میں شریانوں کا ایک گچھا بھی ہوتا ہے جسے عنقودی جسم (Clone Bulos) کہتے ہیں۔ یہ عنقودی جسم در حقیقت کیسہ میں داخل ہونے والی شریان اور اس کے خون کو واپس لے جانے والی ورید کے مابین انتہائی باریک خود بینی شریانوں کا گچھا ہوتا ہے۔ عنقودی جسم گروں کی کارکردگی میں بڑا اہم مقام رکھتا ہے۔ خون سے مضر مادوں کو چھاننا اور جسم سے زائد پانی کی کثیر مقدار کو علاحدہ کرنا انہی کا کام ہوتا ہے۔ یہ کام کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہوسکتا ہے کہ فی منٹ گردوں میں بارہ سو ملی لیٹر خون کی آمد اور روانگی ہوتی ہے۔ خون کی یہ کثیر مقدار گردے کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور اس کا مقصد قلیل مدت میں لاکھوں کی تعداد میں گردوں میں موجود انابیب بولیہ کے ذریعہ خون سے مضر مادوں کو علیحدہ کرنا ہوگا۔ انابیب بولیہ کی اس کوشش کے نتیجہ میں 120 ملی لیٹر رقیق مادہ جب انابیب سے گزرتا ہے تو اس کی ماہیت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور پانی کی کثیر مقدار ضرور حیاتی کیمیاوی مادے انابیب کے ذریعہ دوبارہ جذب کر لیے جاتے ہیں اور پیشاب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گردوں کی کارکردگی جب کسی وجہ سے متاثر ہوتی ہے تو جسم میں حیاتی کیمیاوی مادوں کا تناسب برقرار رکھنا دشوار ہوتا ہے اور عمل استحالیہ کے باعث پیدا ہوئے مضر مادوں کی علاحدگی خون سے ممکن نہیں ہوتی ہے غیر ضروری الکٹرا ولائٹ اور پانی کو جسم سے نکالنا دشوار ہوتا ہے، پیشاب کا بننا ممکن نہیں ہوتا ہے۔

گردوں کی شدید ناکردگی (Acute Renal Failure):

گردوں کی شدید ناکردگی کے مندرجہ ذیل اسباب ہوتے ہیں:

1 گردوں کو اپنے کام کے انجام دہی میں دشواریاں کا سامنا ہونا۔

2 گردوں کی انابیب کو کسی بھی وجہ سے ناقبل تلافی نقصان ہونا اور اذیتوں کا شکار ہونا۔

1 گردوں کی فعلی دشواریاں: یہ صورت خصوصاً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب گردے بذات خود اذیتوں کے شکار نہیں ہوتے ہیں لیکن جسم کو لگی بیماریوں یا اذیتوں کی وجہ سے ان پر ضمنی اثرات مرتب ہوتے ہیں جسے جسم میں پانی کی کمی یا امعائی قنال میں خون کے اخراج کی صورت میں عضلات ہیکل (Skeletal Muscle) کے نسیجوں کے ناکارہ ہونے پر خون میں کریاٹی نن کے مقدار کے زیادہ ہونے میں خون کے دباؤ میں کمی، شدید قلبی

گردے کی اندرونی ساخت

نااہلی (Acure Cardiac failure) اور شاک صورتوں میں گردوں کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ پیشاب کا بننا ایسی صورت میں ممکن نہیں ہوتا ہے اور اس کی پیدائش چوبیس گھنٹوں میں بیس ملی لیٹر تک جا پہنچتی ہے، ساتھ ہی ساتھ پیشاب کی کثافت نوعی (Specific Gravity) میں اضافہ ہوتا ہے۔

گردوں کی نا قابل تلافی نقصان کی صورت: یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ گردوں کی انابیب کسی بھی وجہ سے متاثر ہو جاتی ہیں اور ان کے خلیہ ناکارہ ہوتے ہیں۔ باؤمین کیسہ میں موجود شریانوں کو خون کی فراہمی میں دشواری ہوتی ہے اور عنقودی جسم سے خون سے مضر مادوں کی علاحدگی ناممکن ہوتی ہے جس کے نتیجے میں پیشاب کا بننا آسان نہیں ہوتا ہے۔

علامتیں: گردوں کی کارکردگی جب کسی وجہ سے شدید طور پر متاثر ہوتی ہے تو ابتدا میں علامتیں واضح نہیں ہوتی ہیں لیکن جیسے ہی جسم میں حیاتی کیمیاوی مادوں کا توازن بگڑتا ہے تو پیشاب کی آمد کم ہوتی ہے یا وہ سرے سے آنا بند ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی پیشاب کے ہمراہ خون بھی آنے لگتا ہے۔ بھوک کم لگتی ہے یا مر جاتی ہے۔ تھکن، کسلمندی طاری ہوتی ہے۔ ضیق النفس کا سامنا ہوتا ہے۔ مریض کسی مسئلہ پر ذہن کو مرکوز نہیں کر پاتا ہے۔ ان علامتوں کے سامنے آنے پر بھی اگر بیمار کا مناسب علاج نہیں کیا جاتا ہے تو قے آنا شروع ہوتی ہے۔ مریض پر غنودگی طاری ہوتی ہے۔ جسم کے عضلات میں پھڑکن (Twitching) ہوتی ہے اور بیمار تشنج کا شکار ہوتا ہے۔ یہ علامتیں بہت دیر تک برقرار نہیں رہتی ہیں اور مریض کی حالت مزید بگڑنے لگتی ہے۔ بیمار موت کے قریب ہو جاتا ہے۔

علاج اور تیمار داری کا طریقہ: گردوں کی کارکردگی شدید طور پر متاثر ہونے کی شکل میں...... بیمار کے علاج میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور بیمار کی تیمار داری تن دہی سے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جسم میں حیاتی کیمیاوی مادوں کے بگڑتے ہوئے توازن کو بحال کرنا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جسم میں پانی کی کمی بیشی کے اندازہ کی خاطر کیے جانے والے روایتی طریقے جلدی مشاہدے وغیرہ سود مند نہیں ہوتے ہیں اور اس کے بجائے مریض کے وزن میں ہونے والے تغیر پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ گردے کی شدید ناکردگی میں بیمار کے وزن میں عموماً 0.2 کلوگرام سے لے کر 0.4 کلوگرام کی روزانہ کمی ہوتی ہے۔ ان باتوں کے علاوہ مریض چوبیس گھنٹوں میں کس قدر پیشاب کرتا ہے اور کتنا پانی مریض کو دیا جاتا ہے اس کا بھی حساب رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گردوں کی کارکردگی کا مزید اندازہ کرنے کے لیے خون میں یوریا، فاسفورس، کیلشیم، ہیموگلوبین کی مقدار معلوم کی جاتی ہے۔

گردوں کی شدید ناکردگی میں چونکہ اور دیگر مسائل بھی ہوتے ہیں جیسے جسم میں آکسیجن کی کمی، دل کی کارکردگی میں ہم آہنگی برقرار نہیں رہ پاتی ہے۔ تیزابیت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ پوٹیشیم جسم کے نسیجوں کو زیادہ دستیاب ہوتا ہے۔ پانی بدن میں ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے، تنفس میں دشواری کے امکانات ہوتے ہیں، اس لیے علاج میں ہوشیاری کا ثبوت دینا ضروری ہوتا ہے۔ گردوں کی شدید ناکردگی میں کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اکثر تیمار دار بیمار کو کثرت سے پانی پلانے پر یقین رکھتے ہیں اور سوچتے ہیں

کہ شاید ایسا کرنے سے گردے اپنا کام شروع کر دیں گے یہ بہت بڑی بھول ہوتی ہے، بغیر سوچے سمجھے بیمار کو کثرت سے پانی پلانے سے جسم میں نہ کہ پانی کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے بلکہ نسیجوں کو پوٹیشیم کی مضر مقدار فراہم ہو جاتی ہے اور بیمار انجانے طور پر موت کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے۔ ان دشواریوں کے مدنظر گردوں کی شدید ناکردگی میں مریض کو اسی قدر پانی دینا مناسب ہوتا ہے جتنا کہ اسے ضرورت ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ پوٹیشیم معمول پر رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنا ضروری ہوتے ہیں:

1 غذائی مادے یا پھل جن میں پوٹیشیم کی مقدار زیادہ ہوتی ہے ان سے احتراز کیا جاتا ہے۔

2 فاسد زخموں اور پھوڑوں سے مواد نکال دیا جاتا ہے۔

3 پوٹیشیم کو محدود کرنے والی ریزن جیسے Disodium Ploystyrne Sulfonate میں تین بار براہ دہن یا مقعد پندرہ سے تیس ملی گرام وزن میں بدن میں داخل کی جاتی ہے۔

پوٹیشیم کے اثرات بد کو زائل کرنے کے لیے کیلشیم کے نمکیات کا حل بھی اندرونورید داخل کرتے ہیں اور پیشاب لانے کی غرض سے Mannitol کا پچیس فیصد حل بھی اندرون ورید داخل کرتے ہیں۔ Mannitol کے استعمال سے کبھی کبھی جسم پر نامناسب اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں اور خلیوں کے مابین رقیق مادوں میں اضافہ ہوتا ہے، پوٹیشیم کی فراوانی ہوتی ہے۔ پیشاب لانے کی غرض سے Furosemide کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

گردوں کی شدید ناکردگی میں چونکہ خون بھی متاثر ہوتا ہے اور سرخ ذرات کی قلت اور خرابی کے سبب خون سے آکسیجن کم ملوث ہوتی ہے۔ اس لیے جسم کی ضرورتوں کے مدنظر بیمار کو خون بھی فراہم کرتے ہیں اور مریض کی غذا کا خصوصی دھیان رکھتے ہیں۔ بیمار کو اسی قدر کیلوری (Calerie) بہم پہنچائی جاتی ہے جتنی کہ اسے ضرورت ہوتی ہے۔ پانی مریض کو دن اور رات میں چوبیس گھنٹہ میں ہوئے پیشاب سے نصف لیٹر سے تھوڑا زائد دیتے ہیں۔ یوریمیا کی کیفیت میں جب کہ بیمار خصوصی طور پر چڑچڑا ہونے لگتا ہے تو مسکن ادویات تجویز کی جاتی ہیں لیکن مسکن ادویات کے استعمال میں خصوصی احتیاط کرتے ہیں اور وہی ادویات تجویز کرتے ہیں جن کا اخراج ممکن ہوتا ہے۔

گردوں کی مزمن ناکردگی (Chronic Renal Failure):

گردوں کی مزمن ناکردگی یا مزمن نفرائٹس استسقاء الکلیہ (Hydronephrosis) پیشاب کی راہ میں رکاوٹ، غدہ مذی (Prostrategland) کے بڑھنے ہونے، غزائیہ میں رکاوٹ، خون کے دباؤ میں اضافہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔

علامتیں: گردے کی مزمن ناکردگی میں ابتدا میں علامتیں غیر واضح ہوتی ہیں۔ بیمار کو غیر معمولی تھکن کا احساس ہوتا ہے۔ جسم میں خون کی کمی ہوتی ہے لیکن جب کبھی گردوں کی ناکردگی طویل ہوتی ہے تو مندرجہ ذیل علامتیں سامنے آتی ہیں:

1 ہچکی آنے لگتی ہے۔

2 قے آتی ہے اور دست کے امکانات ہوتے ہیں۔

3 سانس کی آمد کے لیے مریض کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور معمول کے مطابق بھرپور سانس نہ لے کر اسے رفتہ رفتہ لیتا ہے۔

4 پیشاب کی آمد کم نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔

5 پیشاب میں البیومن کی آمد ہوتی ہے۔

6 مریض کی بصارت پر اثر پڑنے لگتا ہے اور اسے کبھی کبھی دھندلا دکھائی دینے لگتا ہے۔

7 خون کے دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔

8 خون میں یوریا کی مقدار بڑھ جایا کرتی ہے۔

9 عضلات میں پھڑکن (Twitching) ہوتی ہے اور غنودگی ہوتی ہے جو کہ کوما کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔

علاج اور تیمارداری کے طریقے: گردے کی مزمن بیماریوں میں چونکہ علاج دشوار ہوتا ہے اس لیے کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ جسم کو ہونے والی اذیتوں میں کمی واقع ہو سکے۔ یوریا کے جسم پر مرتب ہونے والے اثرات بد پر قابو حاصل کرنے کے لیے غذا پر پروٹین کی مقدار کم کر دی جاتی ہے اور روزانہ صرف چالیس گرام کے قریب پروٹین مریض کو دی جاتی ہے۔ ان کے دباؤ میں اضافہ اگر غیر معمولی ہوتا ہے تو اسے دواؤں سے کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب کبھی ایسا نہیں کیا جاتا ہے تو گردوں کی کارکردگی مزید متاثر ہوتی ہے اور وہ زیادہ ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اکثر اس غرض سے خون سے یوریا، کیلشیم اور دوسرے مادوں کو نکالنے کے لیے Dialysis کا طریقہ اپناتے ہیں خون سے مشینی گردے کے سہارے ان مادوں کو علیحدہ کر دیتے ہیں اس کے علاوہ جب کبھی گردے ناکارہ ہو جاتے ہیں تو ان کو بدل دیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے حادثہ کے شکار صحتمند افراد کے گردے کام میں لائے جاتے ہیں۔

(ماخذ: تیمارداری، حسین فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، سن اشاعت 1990)

حسن کی نگہداشت

چہرے پر چمک حاصل کرنے کے 5 طریقے

ہم سب چاہتے ہیں کہ ہماری جلد چمکدار ہو، اور سچ پوچھیں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کچھ چیزوں کا خاص خیال رکھیں، چمکتی ہوئی جلد حاصل کرنے کے لیے کچھ مختلف کرنے کی ضرورت نہیں، بس اپنا خیال رکھیں کچھ بیوٹی ٹپس کو روزمرہ کی زندگی میں اپنانا پڑتا ہے۔

یوں تو بازار میں کئی طرح کے علاج دستیاب ہیں لیکن یہ ہر کسی کی جلد کو سوٹ نہیں کرتے اس لیے چمکدار جلد حاصل کرنے کے لیے ہم گھریلو ٹوٹکے آزما سکتے ہیں۔

چہرے پر چمک اور خوبصورتی موجود رہے، یہ آج ہر لڑکی کی خواہش ہے چاہے اس کی عمر کوئی بھی ہو۔ گھر اور کچن میں ایسی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن کی مدد سے ہم اپنے چہرے کو نکھار سکتے ہیں۔ کچھ اچھی عادتیں چمکدار جلد حاصل کرنے میں بھی آپ کی مدد کرتی ہیں۔

1. اچھی نیند لیں

سارا دن کام کرنا، رات کو دیر تک جاگنا اور 8 گھنٹے پوری نیند نہ لینا آپ کی جلد کے لیے اچھا نہیں ہے، یہ آپ کی ذہنی اور جسمانی صحت پر بھی منفی اثر ڈالتا ہے۔ پوری نیند نہ لینے سے صبح کے وقت آپ کی آنکھیں سوج جائیں گی اور جب آپ کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمودار ہوں گے، آپ تھکاوٹ محسوس کریں گے اور آپ کی جلد پھیکی نظر آئے گی۔

جب آپ سو رہے ہوتے ہیں تو اسی وقت آپ کی جلد کے خلیات میں اضافہ ہوتا ہے۔

2. وافر مقدار میں پانی پیے

پانی کی وافر مقدار ہماری جلد کو نکھارنے میں مدد دیتی ہے، ہمارے جسم کے اندر کی گندگی کو دور کرتی ہے اور جسم کے نئے خلیے بناتی ہے، اگر آپ چاہیں تو اپنے پانی میں صحت بخش چیزیں ڈال کر بھی پی سکتے ہیں، اس طرح پانی کے فوائد بھی بڑھ جائیں گے۔

صبح کے وقت آپ ایک چٹکی دار چینی ملا کر پانی میں ابال کر پی سکتے ہیں، اس سے نہ صرف وزن کم کرنے میں مدد ملے گی بلکہ آپ کو چمکدار جلد بھی ملے گی۔ اس کے علاوہ آپ چاہیں تو اسٹرابیری کا جوس پانی میں ملا کر بھی پی سکتے ہیں۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے چہرے کے دھبے ختم ہو جاتے ہیں اور چہرے پر نکھار آتا ہے۔

3. ورزش۔باقاعدگی سے ورزش کریں

ورزش کا مطلب صرف وزن کم کرنا نہیں بلکہ جسم کو شکل وصورت میں لانا اور چہرے پر چمک لانا ہے۔ورزش سے چہرے کی رونق بڑھتی ہے اور دماغ بھی خوش رہتا ہے۔یہی نہیں موڈ بھی اچھا رہتا ہے،جسم تھک جاتا ہے اور گہری نیند بھی آتی ہے جو کہ چہرے کی جلد کے لیے بہت ضروری ہے اچھی اور بھرپور نیند لینے سے چہرہ خوبصورت نظر آنے لگتا ہے۔

سوریہ نمسکار،چہل قدمی،سائیکل چلانا،جاگنگ،سکپنگ،ڈانسنگ جیسی ورزشیں جلد کو چمکدار بنانے کے لیے بہترین ہیں،اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم روزانہ تیز چہل قدمی (تیز رفتاری سے چلنا) ضرور ہے۔روزانہ چند منٹ کریں پھر ایک ماہ بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کا چہرہ بدل گیا ہے،یہ گھریلو علاج ایسا ہے کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

4.یوگا کی مشق

آپ کی جلد کو چمکدار بنانے کے لیے یوگا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

یوگا آپ کی جلد کے مسلز کو سخت اور نکھار دیتا ہے۔جسمانی ورزش کے ساتھ ساتھ یہ آپ کو ذہنی طور پر سکون کر دیتا ہے۔جب تک آپ اندر سے صحت مند نہیں ہوں گے،اس سے اطمینان اور سکون نہیں ملے گا۔

یوگا میں جو اہم چیزیں چہرے پر نکھار لاتی ہیں وہ ہیں۔چکراسن، سروانگاسن،ہلاسن،شرشاسن اور پرانایام۔یہ آسن جسم میں آکسیجن اور خون کی روانی کو بڑھاتے ہیں جس سے چہرے پر نکھار آتا ہے۔یہ یوگا چہرے کی جھریوں کو کم کرتے ہیں۔یہ جلد کی سستی کو کم کرتا ہے اور چمکدار جلد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

5.صابن کا استعمال نہ کریں۔

صابن کے استعمال کے بغیر آپ کو اپنی جلد صاف محسوس نہیں ہوتی لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ صابن کا زیادہ استعمال آپ کے چہرے کی جلد کے لیے اچھا نہیں ہے؟ صابن میں کچھ کیمیکلز ایسے ہوتے ہیں جو جلد کو بے جان بنا دیتے ہیں۔یہی نہیں آپ کی جلد کو خشک بنا کر جلد سے قدرتی تیل نکال کر نمی چھین لیتے ہیں۔جلد کا پی ایچ لیول غیر متوازن ہو جاتا ہے اور جلد کو نکھار آنے لگتا ہے۔

اگر آپ چاہیں تو صابن کی بجائے گھریلو اشیاء کا استعمال کر کے اپنے چہرے کی جلد کو صحت مند رکھ سکتے ہیں۔مارکیٹ میں کچھ قدرتی فیس واش بھی دستیاب ہیں،جو آپ کی جلد کو خشک اور بے جان نہیں بناتے۔

(بحوالہ:www.skinkraft.com)

☐☐☐

تاثرات: نگر نگر سے

'خواتین دنیا' جولائی 2022 نظر نواز ہوا۔ ظاہر ہے کہ پہلی نظر تو سرورق پر ہی قائم ہوگی پر کسے خبر تھی کہ اسے نہارتے ہی بشر نواز کے یہ دو مصرعے دل و دماغ کو معطر کر جائیں گے۔

ع برستا بھیگتا موسم دھواں دھواں ہوگا
ع بھٹکتے ابر میں چہرہ کوئی بنا ہوگا

اس جریدہ کی ترتیب میں کوئی گیارہ اصناف سخن کے ذیل میں کوئی ڈیڑھ درجن ذیلی سرخیاں شامل ہیں۔ خاتون شاعرات کے تذکروں کی ابتداء یعنی ''بہارستان ناز'' سے لے کر ''حیدرآباد نسوانی دنیا'' تک اور اب تو خواتین پر مرکوز بہت سی کتابیں و رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ یہ ادبی تحریک و ترغیب بہت خوب ہے لیکن بلند حوصلگی محدود مثالوں میں ہی خوش آتی ہے۔ ''شخصیت'' (ص5) سے لے کر ''جہانِ نسواں'' (ص35) تک معروف و غیر معروف مصنّفین نے ''غیر معروف و معروف ادیب و شاعرات کی محض قصیدہ خوانی کی ہے بجائے اس کے کہ ان مضامین پر کچھ افادی تنقید کی جاتی۔ ادیبوں اور شاعرات پر توصیفی مضامین لکھنے کا ایک عجیب وطیرہ چل پڑا ہے۔ البتہ ان کے درمیان ''ادب اطفال کا نسائی اظہار'' (ص22) ایک اچھوتا اور اچھا مضمون ہے۔ اس میں پہلے کسی ادیبہ کی ادبی سرگرمی پر نظر ڈالی گئی ہے اور پھر بتایا گیا ہے کہ انھوں نے ادب اطفال میں کیا کارنامے انجام دیے ہیں۔ مضمون کی پیش کش نہایت عمدہ ہے۔ ''حسن سخن'' (ص36) پر محترمہ شہناز فاطمہ صدیقی کی دونوں غزلیں بہت خوب اور اپنے آپ میں گہرائی و گیرائی لیئے ہوئے ہیں۔ ''افسانہ'' (ص38 تا 52) میں پہلا افسانہ ''آ و اب لوٹ چلیں'' میں ڈاکٹر شمیم صادقہ نے عملی نفسیات کا بڑی چابکدستی سے استعمال کیا۔ کیا بہت خوب اور بڑی اچھی کہانی ہے۔ ''درد آشنا'' بھی اچھا افسانہ ہے۔ پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ اور یہ ''فیس بک سے واٹس اپ'' میں تو مصنفہ نے سائنس اور سماج کے تانے بانے بُن کر بڑا دلچسپ ڈیزائن تیار کیا ہے۔ بہت خوب۔ ''صحت'' (ص55 تا57) میں ایک مضمون ''نزف الدم بعد سن یاس'' (ص55) ایک اچھا مگر مبہم سا مضمون ہے۔ اس میں نزف الدم بعد سن یاس کے گیارہ اسباب تمام تر انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں حالانکہ انھیں اردو کونسل کی شائع شدہ، بیشتر طبی کتب اور قاموس المعارف کی مدد سے اردو میں منتقل کیا جاسکتا تھا۔ اس کوتاہی سے مضمون کی افادیت میں کمی واقع ہوگئی کیوں کہ اس سب سے کم مایہ قارئین محروم رہ جاتے ہیں۔ تاہم اس دشواری کو نظر انداز کیا جائے تو اچھا مضمون ہے۔ ''آرائش و زیبائش'' (ص58) میں ''حسن کی نگہداشت'' کے بارے میں موثر ٹوٹکے اور نسخے درج ہیں جن کی مدد سے متعلقہ خواتین و قارئین بہرہ مند ہوسکتے ہیں۔ تاثرات (ص60) میں نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اخیر میں ''خواتین خبرنامہ'' (ص61) درج ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ اس بوقلمونی اور تنوع کی کیفیات کو اصغر گونڈوی نے (مجازی انداز میں) کس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

مصطفیٰ ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-II، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا) 431001

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تشریح البدن (جلد اوّل)

ادارہ

پہلی اشاعت:2022

صفحات:421

قیمت200روپے

تاریخ ابن خلدون (جلد سوم)

مصنف: عبدالرحمن ابن خلدون

مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی، مرتب: محمد صہیب

پہلی اشاعت:2022

صفحات:436، قیمت: 215روپے

کلیاتِ جوش (جلد چہارم)

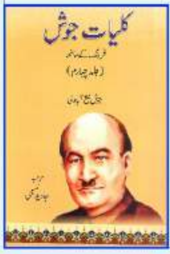

مرتب: جاوید نسیمی

پہلی اشاعت:2022

صفحات:704

قیمت:325روپے

ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت

ترتیب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت:2022

صفحات:145

قیمت:100روپے

ولی دکنی

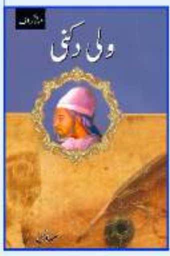

مصنف: عبدالحق

پہلی اشاعت: :2022

صفحات:148

قیمت:90روپے

تدریس جغرافیہ

مصنف: محمد ضیاء الدین علوی

تیسری طباعت:2022

صفحات:173

قیمت:105روپے

پھول بن

شاعر: ابن نشاطی

پہلی اشاعت:2022

صفحات:190

قیمت:115روپے

نیاز فتح پوری کی تحریریں (ایک مختصر انتخاب)

مرتب: ف س اعجاز

پہلی اشاعت:2022

صفحات:166

قیمت:100روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, सितम्बर-२०२२ वर्षः६, अंकः ६

Mahnama Khawateen Duniya Monthly September 2022, Vol.6 , Issue:9

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-09-2022
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

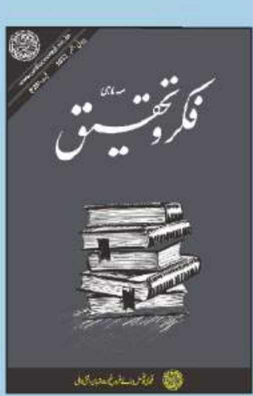

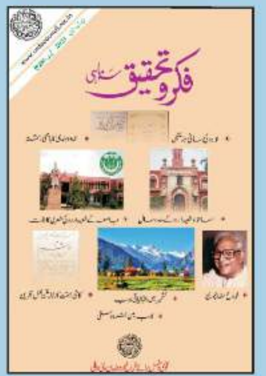

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6